ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جون ۱۹۸۸ء

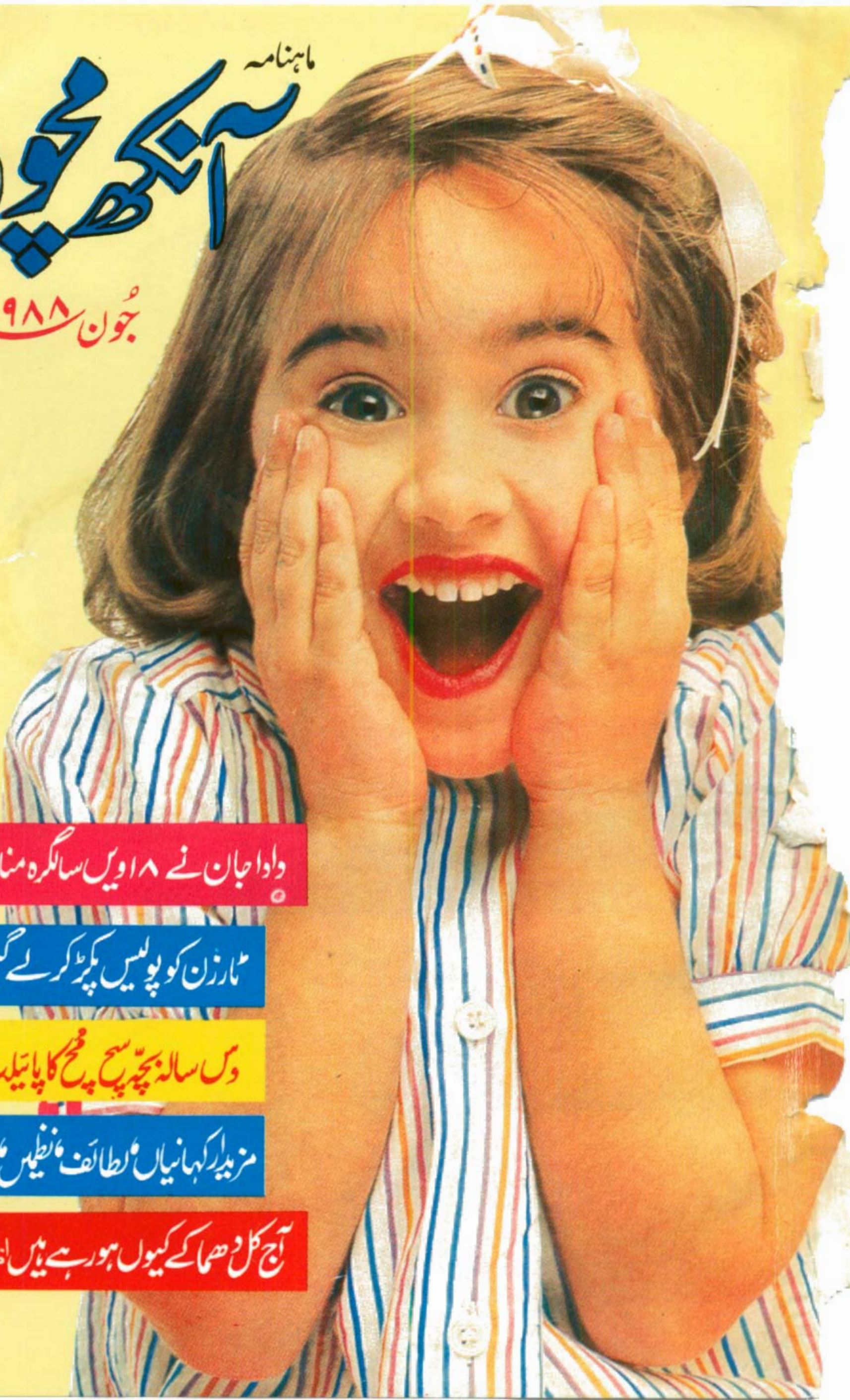

دادا جان نے ۱۸ ویں سالگرہ منائی، یہ سچ ہ

ٹارزن کو پولیس پکڑ کر لے گئی

دس سالہ بچہ سچ مچ کا پائلٹ بن گیا

مزیدار کہانیاں، لطائف، نظمیں، معلوماتی مضامی

آج کل دھماکے کیوں ہو رہے ہیں اظہر نیاز کا انکشاف

"جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم"
بالکل ایسے ہی
گرمیوں کی حدّت میں ٹھنڈے اور شیریں احسا
کا
ایک حسین نام
نورس
قومی مشروب
اب عوامی پیک میں بھی دستیاب ہے
Naurus
نورس
Naurus (Pvt) Limited

مُدیرِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
مُدیرِ مسئول
تجمّل حسین چشتی
مُشاورت
مشفق خواجہ ، امجد اسلام امجد
مُدیرانِ اعزازی
طاہر مسعود
محمد سلیم مُغل
مجلسِ اِدارت
شاہنواز فاروقی ، سیّد خورشید عالم
خطاطی
رئیسُ الحسن ، عارف سعید

جلد نمبر ۲
شمارہ نمبر ۱۲
جون ۱۹۸۸ء
شوّال المکرّم ۱۴۰۸ھ

ماہنامہ
آنکھ مُچولی میں
شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جُملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

گرین گائیڈ اکیڈمی
اِدارہ اِشاعت برائے
تعلیم و تعمیرِ سیرتِ اطفال
زیرِ سرپرستی
ضمیرالدین میموریل آرگنائزیشن

ماہنامہ
آنکھ مچولی
میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ناشر
ظفر محمود شیخ
طابع ۔ زاہد علی ، مطبع ۔ لاریب
پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

گرین
گائیڈ اکیڈمی
برائے خط و کتابت و مقامِ اشاعت ۱۱۲-ڈی، نورس روڈ سائٹ، کراچی

حسنِ ترتیب

اداریہ	۵	۵۹	قہقہے ہی قہقہے (منتخب لطائف)
اچھّی بات	۶	۶۲	دھماکہ (سلسلہ وار ناول) اظہر نیاز
نبیؐ کا صحابی (نظم) ابوالاسرار رمزی	۷	۷۱	میٹھا خیل عارف الرحمٰن
ڈاک ڈاک کس کی ڈاک (خطوط)	۸	۷۳	آخری کلمہ صبا خان
اس ماہ کا نام کیسے پڑا؟ مولانا اسلم شیخوپوری	۱۱	۷۷	گنی چنی معلومات عقیل عباس جعفری
ایک ادیب کی سرگزشت سید کاشف جعفری	۱۴	۸۱	تلاش (قسط وار کہانی) ترجمہ: آصف فرخی
خود غرضی کی سزا (نظم) عبدالعزیز خالد	۱۷	۸۹	انگوٹھے کی فریاد (نظم) مہتاب ظفر
یہ تصویر کس کی ہے؟	۱۸	۹۱	دادا ابا کی اٹھارویں سالگرہ محمد شاہد رفیع
سونڈ ہاتھی کی سید عرفان علی یوسف	۱۹	۹۵	چشم سے چشم نمائی تک علی مرتضیٰ
پی چو کی ڈائری قرۃ العین سلیم	۲۵	۹۷	آخری شرارت عامر یونس
لوہے کا قلعہ سید خورشید عالم	۳۱	۱۰۳	کایا پلٹ سعیدہ نازش
ننھا شاہین شین فاروقی	۳۷	۱۰۶	انکل آئی کیو روبوٹ (سوال جواب)
چاند پیٹر ہوا (نظم) شاہنواز فاروقی	۳۹	۱۰۹	دائرہ معلومات
ہمارے ۳۲ محافظ ابن شہباز خان	۴۱	۱۱۰	نئی تحریریں (مختصر مختصر)
ٹارزن کراچی میں طاہر مسعود سلسلہ وار کہانی	۴۷	۱۱۸	امی ابو کا صفحہ محمد سلیم مغل
افضلا کلیم چغتائی	۵۳		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عید آئی ــــــــ اور گزر گئی!

رنگوں اور خوشیوں سے بھری عید اب کے افسردہ ماحول میں آئی۔ ایک ایسی غمناک فضا میں جب ہمارے دل بجھے ہوئے تھے اور کوئی بات ایسی نہ تھی جس پر خوش ہوا جا سکے۔ اوجڑی کیمپ اور کراچی کے سانحوں کی وجہ سے سارا ملک ہی سوگوار رہا۔ ظاہر ہے جب زمین پر خون بہہ رہا ہو. تو رنگین عید کارڈ بھی بے رنگ محسوس ہوتے ہیں۔ جب ارد گرد بے گناہ لوگ مر رہے ہوں تو کہاں کی عید اور کیسی عید۔ خود زندگی پھیکی پھیکی سی لگنے لگتی ہے۔ مسلمان کے لیے مایوسی کفر ہے. خدا کے فضل و کرم سے یہی اُمید کی جا سکتی ہے کہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔ لوگ امن و سکون کا سانس لیں گے اور آئندہ جو عید آئے گی اس کے دامن میں ہمارے لیے ڈھیروں پھول ہوں گے اُمید کے پھول، محبت کے پھول، شادمانی کے پھول، رنگ برنگے تر و تازہ پھول۔

حالات کیسے ہی ہوں "آنکھ مچولی" اپنے ساتھیوں کی ذہنی تہذیب و تفریح کے لیے خصوصی شمارے پیش کرنے کی روایت پر قائم ہے۔ یوں تو ابھی اس کی عمر صرف دو ہی سال ہوئی ہے لیکن اس مختصر سی مدت میں بھی اس نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لیا ہے۔ ایک سال میں کئی خصوصی شمارے مع تحائف کے پیش کرنا "آنکھ مچولی" ہی کا کارنامہ ہے۔ لیکن ہمارے ساتھیوں کو کیا معلوم کہ انفرادیت کی اس شان کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں کیسے کیسے مشکل مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کراچی میں آئے دن کے ہنگامے اور کرفیو کی وجہ سے زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے پھر بھی ہمیں وقت پہ پرچہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچانا ہوتا ہے اور ہم پہنچاتے ہیں۔ اس سے بڑا اور سنگین مسئلہ مہنگا کاغذ ہے جس کا کوئی علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔ دنیا بھر میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے کاغذ کی قیمتیں کم رکھی جاتی ہیں لیکن ہمارے ملک میں اس کی قیمت میں اس تیزی سے اضافہ ہوا ہے کہ اب ایک معیاری اور بامقصد رسالہ نکالنا دن بہ دن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ رسالے کی قیمت میں اضافہ کیا جائے تو پڑھنے والے کی جیب پر بار پڑتا ہے لیکن ظاہر ہے پرچے اور اس کے معیار کو باقی رکھنے کے لیے بعض ناگوار فیصلے بھی مجبوراً کرنے پڑتے ہیں۔ ان حالات میں بھی ہم نے ہمت کی ہے اور "قہقہہ نمبر" کے فوراً ہی بعد "سالگرہ نمبر" نکالنے کا ارادہ کیا ہے۔ سالگرہ نمبر کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ اسے دیکھ کر آپ پچھلے شماروں کو بھول جائیں گے۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

اچھّی بات

ایک شخص مطالعے میں مصروف تھا۔ پاس ہی اس کا بچہ کھیل رہا تھا۔ بچے نے جب غل مچانا شروع کیا تو اس نے بڑی شفقت سے کہا: "دیکھو بیٹا، ہم پڑھ رہے ہیں۔ شور نہ کیجئے۔" بچہ خاموش ہو گیا۔ لیکن زیادہ دیر ضبط نہ کر سکا۔ جب پھر اُودھم مچانے لگا۔ تو باپ کو ایک ترکیب سُوجھی اس نے میز سے پُرانے اخبار کا ایک ورق اُٹھایا، جس پر دُنیا کا نقشہ بنا ہُوا تھا اور اُسے پُرزے پُرزے کر کے بچے کے حوالے کر دیا اور کہا: "لو بیٹا! اسے برابر والے کمرے میں لے جاؤ اور نقشے کو پھر سے جوڑ لاؤ۔"

بچہ جب چلا گیا تو باپ نے بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ اور دل میں کہا کہ چلیئے تین چار گھنٹوں کے لیئے تو دردِ سر ختم ہُوا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بچہ پندرہ بیس منٹ کے بعد دوڑتا ہُوا آیا اور بڑے فخر سے کہنے لگا: "ابُو نقشہ ٹھیک ہو گیا ہے۔" باپ نے نقشے پر نگاہ ڈالی، پہاڑوں کے سلسلے، دریاؤں کی گذرگاہیں، شہروں کے محلِ وقوع، سب اپنے اپنے مقام پر دُرست پائے۔ پوچھنے لگا: "بیٹا، تو نے یہ کیا کرشمہ دکھایا ہے؟"

بچے نے جواب دیا "ابّو یہ کام بڑا آسان تھا۔ اس نقشے کی دُوسری جانب اتنی ہی بڑی ایک انسان کی تصویر تھی۔ میں نے انسان کی تصویر کو پھر جوڑ دیا ہے۔ دُنیا کا نقشہ آپ سے آپ دُرست ہو گیا ہے!"

نبیؐ کا صحابیؓ

ابوالاسرار رمزی جودھپوری

بیاباں کی تپتی زمیں سے گزرتا
چٹانوں کے سینے پہ چڑھتا اُترتا
شہادت نہ ملنے پہ افسوس کرتا — "چلا جا رہا ہے نبیؐ کا صحابیؓ"

گلے میں حمائل مقدس صحیفہ
زباں پر ہُوَالقَاہِر کا وظیفہ
سفر کر رہا ہے خدا کا خلیفہ — "چلا جا رہا ہے نبیؐ کا صحابیؓ"

کہیں ٹھہر جائے تو منزل صدا دے
اگر چل پڑے تو زمانہ دُعا دے
زمیں پر قدم ہیں فلک پر ارادے — "چلا جا رہا ہے نبیؐ کا صحابیؓ"

ہمالہ کو دوشِ یقیں پر اُٹھائے
جہاں پاؤں رکھے زمیں ڈگمگائے
منازل کی دُھن میں قدم کو بڑھائے — "چلا جا رہا ہے نبیؐ کا صحابیؓ"

جبیں پر پسینے کی موج آفتابی
لبوں پر تبسم گلابی گلابی
نظر انقلابی، قدم انقلابی — "چلا جا رہا ہے نبیؐ کا صحابیؓ"

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

اظہر محمود ۔ جھیو رانوالی ۔ آپ کا مطالبہ ہے کہ خطوں کے جواب اتنی باریک لکھائی میں ہوتے ہیں کہ انھیں پڑھنے کے لیے آنکھ مچولی کے ساتھ عینک کا تحفہ دیا جائے۔ بھئی ہم خطوں کا جواب باریک لکھائی میں اس لیے دیتے ہیں تاکہ جو ساتھی اس لکھائی کو نہ پڑھ سکیں وہ فوراً اپنی آنکھوں کا معائنہ کرلیں۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح ہم آپ کے زیادہ خطوط کا جواب دے سکتے ہیں۔

چندا فیاض حسین بلوچ۔ تاج کالونی، نوابشاہ ۔ قہقہہ نمبر اچھا لگا۔ شکریہ! آپ نے بالکل صحیح نشاندہی کی کہ انعامی مقابلے ذرا کم ہیں۔ انتظار فرمائیے۔ ہم بہت جلد بہت سے نئے انعامی مقابلے شروع کر رہے ہیں۔ چٹپٹے اور مزیدار انعامی مقابلے۔ نئی تحریروں کے صفحات اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ بس ٹھیک ہی ہیں۔ آپ کی تحریریں قابل اشاعت ہوئیں تو چھپ جائیں گی۔

محمد سعید عباس۔ کھوکھراپار۔ کراچی ۔ قہقہہ نمبر کی مبارکباد تو ہم نے قبول کرلی لیکن آپ نے یہ کیا الزام لگا دیا کہ اس میں دو تحریریں نقل شدہ ہیں۔ بھئی ثبوت کے بغیر الزام لگانا نہایت بُری بات ہوتی ہے۔ آپ کی کہانیاں اپنی باری پر چھپ جائیں گی۔

رعنا ظہیر۔ تین ہٹی کراچی ۔ بھئی قسم لے لیجیے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ ہم نے آپ کے پچھلے خطوط کا جان بوجھ کر جواب نہیں دیا۔ آپ تو اپنی ہینڈ رائٹنگ کے سلسلے میں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہی ہیں۔ بھلا ہم نے کوئی شکایت کی ہے۔ جس مضمون کو آپ نے سرقہ قرار دیا ہے۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟ ثبوت لائیے!

امروز خان، مسر ڈھیری ۔ میرے عزیز! یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں کہ اگر اس خط کا جواب نہیں دیا تو آئندہ آپ خط ہی نہیں لکھیں گے۔ بس آنکھ مچولی سے آپ کو اتنی سی محبت ہے اور اس کی تعریف میں تو آپ نے زمین و آسمان کے قلابے ملا رکھے ہیں۔ لیجیے جواب مل گیا۔ مطمئن؟

گل شیرین۔ باڑہ گیٹ، پشاور ۔ بالکل ٹھیک لکھا آپ نے۔ تعلیم، اخبارات و رسائل کے ذریعے پھیلتی ہے۔ خدا کرے آپ ہمیشہ آنکھ مچولی کی قاری رہیں اور آنکھ مچولی، بھی ہمیشہ آپ کی امیدوں اور توقعات پر پورا اُترتا رہے۔

عرفان عاصو۔ کراچی ۔ آپ کی شکایت کی تحقیق کی جارہی ہے اگر آپ کی شکایت درست نکلی تو ہم ضرور کارروائی کریں گے۔ آپ کے بھیجے ہوئے لطیفے اچھے ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔

خرم عبدالحمید بٹ۔ گلشن اقبال کراچی ۔ قہقہہ نمبر نے آپ کی ساری بدگمانیاں دور کردیں۔ خدا کا شکر ہے۔ اس لیے بزرگوں کا کہنا ہے کہ بدگمانی نہیں کرنی چاہیے۔ 'قہقہہ نمبر' کے جو مضامین آپ کو اچھے لگے ان کے مصنفوں تک آپ کی مبارکباد پہنچا دی جائے گی۔ آپ نے لکھا ہے کہ اس روتی بسورتی دنیا میں قہقہہ نمبر پیش کرکے ہم نے ایک کارنامۂ عظیم انجام دیا ہے۔ آپ کے تعریفی کلمات سے ہماری محنت وصول ہوگئی۔

حسن مہدی نعرا سانی ا نچولی ۔ کراچی ۔ آپ نے "قہقہہ نمبر" پر تفصیلی تبصرہ لکھا ہے اس سے پتہ چلا کہ آپ نے واقعی اس شمارے کے ایک ایک صفحے کو پڑھا ہے۔ منتخب لطائف کا عنوان "قہقہے ہی قہقہے" آپ کو پسند نہیں آیا۔ اگلے ماہ سے ہم اس کا عنوان تبدیل کردیں گے۔ "آؤ ملائیں ہاتھ" میں طلبہ و طالبات دونوں کا تعارف شائع ہو سکتا ہے۔ صرف طالبات کی تصویر شائع نہیں کی جاتی۔ آپ کا تبصرہ اتنا دلچسپ تھا کہ اُسے پڑھ کر بوریت محسوس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

محمد اعجاز خان، ملتان :- اللہ، اللہ اتنی زبردست دھمکی۔ میرے بھائی! اگر لطیفے دلچسپ ہوئے تو ہم اُسے کیوں شائع نہیں کریں گے! لیکن آئندہ خط نہ لکھنے کی دھمکی نہ دیا کریں۔ اس سے ہم پریشان ہو جاتے ہیں اور ہمارا دل پہلے ہی بہت کمزور ہے۔

ملک جاوید اقبال، راولپنڈی :- آپ کی اتنی ڈھیروں تحریریں قہقہہ نمبر میں شائع ہوئیں پھر بھی آپ کی شکایت باقی ہے۔ اب اس کا کیا علاج ہے! اور ہاں "ماڈرن کسان" پر آپ کا نام شائع نہیں ہو سکا۔ اگر چھپ جاتا تو لوگ آپ ہی کو ماڈرن کسان سمجھ لیتے۔ اس لحاظ سے تو اچھا ہی ہوا نا۔ قہقہہ نمبر کی پسندیدگی کا شکریہ۔

ذیشان ہاشمی، نارتھ کراچی، کراچی :- یوں تو آپ نے قہقہہ نمبر کا تفصیلی پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ جہاں بیشتر اچھی تحریروں کی تعریفیں کی ہیں، وہاں دو ایک مضامین کے بخیے بھی اُدھیڑے ہیں۔ مثلاً فوقیہ مشتاق کی تحریر "ہمسائے کا سایہ" کے بارے میں آپ کا خیال ہے کہ کوئی پڑوسی کسی دوسرے کو اتنی ڈھیر ساری چیزیں ادھار نہیں دیتا۔ بھئی سارے پڑوسی ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ کچھ پڑوسی فیاض ہوتے ہیں، کچھ بے وقوف بھی ہوتے ہیں۔ فوقیہ مشتاق نے ایک سادہ لوح پڑوسی کی معصومیت بیان کی ہے اور پھر مزاح میں مبالغہ تو ہوتا ہی ہے! قہقہہ نمبر کو آپ نے توقع سے بڑھ کر اچھا پایا۔ نوازش، عنایت، شکریہ مہربانی ...!

شازیہ فرحین، ناظم آباد، کراچی :- "قہقہہ نمبر" پڑھتے ہوئے سرورق سے اختتام تک آپ کی بتیسی کھلی رہی، بھئی ہم نے قہقہہ نمبر نکالا ہی اسی لیے تھا کہ ہمارے ساتھی ایک مہینے تک ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بنے رہیں۔ آپ کی کہانی "ہم بنے شاعر" کسی قریبی اشاعت میں چھپ جائے گی۔ اور ہاں جب آپ آنکھ مچولی کو کوئی تحریر ارسال کر دیں۔ تو پھر اُسے کسی اور رسالے میں نہ بھیجا کریں۔

ایم آصف، کراچی :- "قہقہہ نمبر ا" میں ایک غلطی سے نہیں، بہت سوچ سمجھ کر لکھا گیا ہے۔ جب بھی ہمیں موقع ملا تو آپ لوگوں کے ہنسنے ہنسانے کے لیے اس کا دوسرا حصہ بھی شائع کیا جائے گا۔ دوسری جس غلطی کی طرف آپ نے نشاندہی کی ہے اُسے پڑھ کر ہمیں واقعی خوشی ہوئی کہ آپ رسالہ اتنے غور سے پڑھتے ہیں۔ اس غلطی کے ذریعے بس ہمیں یہی معلوم کرنا تھا۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔

ثاقب خان، ھ، ی، یو :- آپ اپنے تینوں سوالوں کے جواب ملاحظہ فرمائیں۔ (الف) آپ کی فرمائش پر جب بھی موقع ملا ہم کسی مشہور کھلاڑی کا انٹرویو شائع کریں گے۔ لیکن آپ کس کھلاڑی کا انٹرویو پڑھنا چاہتے ہیں (ب) جانوروں کے بارے میں اکثر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اپنے کسی پسندیدہ جانور کے بارے میں آپ مضمون پڑھنا چاہیں تو لکھ بھیجئے (ج) آنکھ مچولی کے پُرانے شمارے کے لیے منی آرڈر ارسال کریں۔

ابنِ نظیر محمد بھٹی، لانڈھی کراچی :- آپ کی بھیجی ہوئی تحریریں آنکھ مچولی میں شائع نہیں ہوئیں جس کا آپ کو دُکھ ہے۔ آپ کے دُکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں لیکن بھئی تحریر بھی تو اچھی ہونی چاہیئے۔ آپ نے کسی نامعلوم مضمون کو "احمقانہ" قرار دیا ہے۔ لیکن اس مضمون کا نام نہیں لکھا۔ اب ہم کیسے فیصلہ کریں کہ وہ تحریر واقعی احمقانہ تھی کہ نہیں۔ اگر ہم مضامین پڑھے بغیر چھاپتے پھر تو آپ کی تحریر بھی چھپ چکی ہوتی۔ بہرحال آپ مایوس نہ ہوں۔ اور خوب محنت سے کوئی اچھا سا مضمون، کہانی یا اقتباس ارسال کریں۔ آپ کی تحریر شائع کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔

وسیم عباس، سیالکوٹ کینٹ :- آپ نے بڑا مزے کا خط لکھا ہے۔ چار لطیفے، ایک کہانی، اور ایک نظم ارسال کر کے آپ فرماتے ہیں کہ چار لطیفوں میں سے کوئی سا ایک لطیفہ شائع کر دیں۔ اگر نہیں کرنا تو کہانی شائع کر دیں اگر وہ بھی شائع نہیں کرنی تو نظم شائع کر دیں۔ اگر کچھ بھی شائع نہیں کرنا تو آپ اپنے ایک پڑھنے والے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ دیکھئے ... ایسا غضب نہ کیجئے گا آنکھ مچولی کو آپ سے محبت ہے اور آپ کی دوستی اُسے عزیز ہے اور دوستی میں اس قسم کی دھمکیاں نہیں دی جاتیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی جو چیز بھی اچھی ہوئی چھپ ہی جائے گی۔

حامد علی شاہ، ڈی کے :- قہقہہ نمبر اور اس کے ساتھ تحفہ پا کر آپ کو خوشی ہوئی۔ آپ کی خوشی میں ہم بھی خوش ہیں۔ بہترین لطیفے پر انعام دینے کے وعدے پر نہ صرف ہم قائم ہیں بلکہ انعامات بھیجے بھی جا رہے ہیں۔ آپ کی تحریر اپنی باری آنے پر چھپ جائے گی۔

محمد شفیق، قصور :- بہت خوب آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم اس وقت تک خط کا جواب نہیں دیتے جب تک ہمیں مٹھائی کا ڈبہ نہ بھجوایا جائے۔ بھئی ہم آپ کے خط کا ویسے ہی جواب دے دیں گے اور مٹھائی آپ ہماری طرف سے کھالیں۔ قہقہہ نمبر میں آپ کی تحریر شائع نہ ہونے کا ہمیں بھی افسوس ہے لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کوشش جاری رکھیے۔ آپ نے سنا نہیں کہ حرکت میں برکت ہے۔

نور خان عنزائی، گلگت :- آنکھ مچولی میں آپ کی تحریروں کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ شوق سے ہمیں اپنی چیزیں بھیجئے۔ آنکھ مچولی کی شان میں نظم لکھنے سے بہتر ہے کہ آپ پاکستان کی شان میں کوئی خوبصورت سی نظم لکھیں۔ آپ تو پاکستان کے حسین ترین علاقے میں رہتے ہیں۔ قدرت کے حسین مناظر بھی آپ کی نظم کا موضوع بن سکتے ہیں۔

محمد نظیر بھٹی، رامسوامی، کراچی :- پیارے بھٹی صاحب! کتنا حسین اتفاق ہے کہ قہقہہ نمبر آپ کو اُس دن ملا جس روز آپ کی سالگرہ تھی۔

"تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

آنکھ مچولی کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے آپ کے مشورے نوٹ کر لیے گئے ہیں۔ آپ نے اپنے خط کے ساتھ "آنکھ مچولی قہقہہ نمبر" کے لیے جو

خوبصورت پھول مبارکباد کا بنایا ہے اور اس میں جتنے شوخ رنگ بھرے ہیں اُسے دیکھ کر ہماری آنکھیں روشن ہوگئیں۔ خدا کرے آپ سدا خوش رہیں۔

فرح ناز۔ سکھر۔ لیجئے آپ کے خط کا جواب شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے اب آپ کی یہ شکایت دُور ہو جائے گی کہ ہم تنقیدی خطوط کا بُرا مانتے ہیں سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں تنقید اچھی لگتی ہے کیونکہ اس سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ "دائرہ معلومات" کا سلسلہ اب ہم ختم کر رہے ہیں اس لیے اب اس میں اصلاح بھی ممکن نہیں ہے۔

محمد اصغر ساجد بلوچ، مکران۔ آپ نے دو سال میں ایک خط لکھا اور وہ بھی اس دھمکی کے ساتھ کہ جواب نہ دیا تو آپ خط لکھنا بند کر دیں گے۔ تو سُنیے! ہم آپ کے خط کا جواب شائع کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہمیں آپ سے شکایت یہ ہے کہ دو سال میں صرف ایک خط کیوں لکھا۔ کہانی بھیج دیجئے۔ پڑھ کر فیصلہ کریں گے۔

عمر علی بیگ، اٹک۔ آپ نے کارٹون بھیجا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم اتنا ہنسے، اتنا ہنسے، اتنا ہنسے کہ بس ہنستے ہی رہے اور ہنسی ہنسی میں کارٹون کی ہنسی اُڑ گئی۔ کہانی کب بھیج رہے ہیں آپ؟

صائمہ یونس بٹ، لاہور۔ "تلاش" ایک اعلیٰ معیار کا ناول ہے۔ حیرت ہے آپ کو پسند کیوں نہیں آیا۔ اسے غور سے پڑھیے "حق اسکواڈ" کے لیے آپ کو ابھی انتظار کرنا ہوگا۔ آپ کا لطیفہ اچھا ہے چھپ جائے گا۔

سید محمد عزیز، سید محمد رشید، کراچی۔ اگر آپ نے دوسرے رسالے چھوڑ کر آنکھ مچولی پڑھنا شروع کر دیا ہے تو یہ ہماری کامیابی ہے اور اس پر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے آنکھ مچولی کو اس مقام پر پہنچا دیا۔ رہا آپ کا یہ سوال کہ وسیم اکرم پنجابی ہیں یا مہاجر۔ تو میرے عزیز۔ وسیم اکرم کے بارے میں ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ پاکستانی ہیں، مسلمان ہیں۔ ان کے کھیل سے دُنیا میں ہمارے مُلک کا نام روشن ہوتا ہے۔ باقی باتیں غیر ضروری ہیں۔

شگفتہ ناز۔ لیّہ۔ آنکھ مچولی میں بچّوں کی تصویریں "آؤ ملائیں ہاتھ" میں چھپتی ہیں۔ اس کے لیے آپ پاسپورٹ سائز تصویریں ارسال کریں۔

ذیشان احمد، سرگودھا۔ آپ کی اس بات سے ہمیں اتفاق ہے کہ اگر کسی کے خط کا جواب نہ دیا جائے تو اس کے دل پر نہایت گہرا اثر ہوتا ہوگا، لیکن آپ ہی بتائیے کہ آنکھ مچولی میں ہر ماہ بچوں کے سینکڑوں خطوط آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا جواب دینا ممکن نہیں ہوتا۔ ہم صرف انھی کا جواب دیتے ہیں جن میں کوئی جواب طلب بات ہو، آپ کی چیزیں قابلِ اشاعت ہوں گی تو انھیں چھپنے سے کون روک سکتا ہے۔ آپ کا لطیفہ پُرانا ہے۔ کوئی اور لطیفہ بھیجئے۔

موناانور، لاہور۔ آپ کی کہانی "وطن کے محافظ" جو آپ نے ڈرتے ڈرتے ہمیں بھیجی تھی۔ ناقابلِ اشاعت ٹھہری۔ اب آئندہ کوئی تحریر بھیجنے سے پہلے اسے کسی کو دکھا کر ارسال کیجئے گا تاکہ اس میں کم سے کم غلطیاں ہوں اور ہم اُسے چھاپ کر آپ کو خوش کر سکیں اور خود بھی خوش ہو سکیں۔

عبدالواحد سعود آباد، کراچی۔ آپ نے بڑی اچھی تجویزیں دی ہیں۔ انشاءاللہ ہم اُن پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ کو شکایت ہے کہ خطوط کے جوابات کی کتابت اتنی باریک کیوں ہوتی ہے۔ آپ کی آنکھوں کو پہلے ہی چشمہ لگا ہوا ہے کہیں اس کے نمبروں میں اضافہ نہ ہو جائے۔ میرے عزیز! باریک کتابت میں اگر ہم خطوط کے جوابات نہ دیتے تو شاید آپ کے اس خط کے جواب کی باری تین مہینے بعد آتی۔ اس صورت میں بھی آپ کو شکایت ہی ہوتی۔ آپ کی نظم "بُلبُل اور جگنو" ہمیں نہیں مل سکی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمیں کوئی اور اچھی سی نظم بھیجیں۔

محمد اسحاق تبسّم، ہری پور۔ حیرت ہے کہ آپ نے پورے پندرہ خطوط لکھے، تصویریں بھیجیں لیکن افسوس کہ نہ آپ کا کوئی خط شائع ہوا نہ تصویر آپ کی الم انگیز کہانی سُن کر یقین جانیے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مزید یہ جان کر دل پر چوٹ پڑی کہ اب آپ ہمیں خط لکھنا چھوڑ دیں گے۔ چلیے ہماری قسمت "آؤ ملائیں ہاتھ" کے لیے پاسپورٹ سائز تصویر (بلیک اینڈ وائٹ) ارسال کریں۔

سیّد اسد، پشاور۔ مختلف شاعروں پر آپ نے جو مضامین لکھے ہیں ان کے بارے میں اسی وقت رائے دی جا سکتی ہے۔ جب ان کا مطالعہ کر لیا جائے۔ آپ مناسب سمجھیں تو یہ مضامین ہمیں ارسال کر دیں تاہم ان کو چھاپنے یا نہ چھاپنے کے بارے میں ہم کوئی پیشگی وعدہ نہیں کرتے۔ قہقہہ نمبر آپ کو اچھا لگا شکریہ۔

انصار محمود بھٹی، لالہ موسیٰ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے رسالے میں کوئی مستقل اسپورٹس کالم نہیں ہے۔ اگر آپ ہمارے لیے کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ بسم اللہ۔ آپ کے مضامین کا انتظار رہے گا۔

راجہ راشد بشیر۔ گرومندر، کراچی۔ آپ کی تجویز پر ہم ناقابلِ اشاعت مضامین کی فہرست شائع کرنے پر غور کریں گے۔ رہا سوال یہ کہ ہم آپ کی تحریر کیوں شائع نہیں کرتے تو یقین مانیے کہ ہمیں آپ سے کوئی دُشمنی نہیں ہے اچھی تحریریں تو ہماری کمزوری ہیں اور ہم اُسے ہر قیمت پر شائع کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ اپنا غصّہ تھوک دیجئے۔ آپ کی کہانی اچھی ہوئی تو لازماً چھپے گی۔

فوزیہ ثمرین، لیاقت آباد، کراچی۔ پیاری بہن! لفافے میں پیسے ہرگز نہ بھیجیے گا۔ اگر کھو گئے تو ہم ذمّہ دار نہ ہوں گے۔ آخر منی آرڈر کرنے میں آپ کو کیا دشواری لاحق ہے۔ قہقہہ نمبر پڑھ کر آپ نے خوب قہقہے لگائے، چلئے ہمارا مقصد پورا ہوا۔

فیصل مختار، شہر کا نام نہیں لکھا۔ بھئی دھمکیاں نہ دیا کریں آپ! اگر آپ کی کہانی دلچسپ اور اچھی ہوگی تو آنکھ مچولی میں اُسے شائع کر کے ہمیں خوشی ہوگی لیکن اگر وہ سرے سے اچھی ہی نہ ہو تو پھر وہ کہیں بھی چھپ جائے ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

مُحمّد اَسلمؔ شیخوپوری

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

شوّال

اسلامی سال کا دسواں مہینہ ہے اس مہینے کے نام سے بھی عربوں کی فطری سادگی اور دیہاتی زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ جب اہلِ عرب "شالت الابل" کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے "اُونٹ کا دُم اُٹھا کر چلنا" اور اُونٹ جب مستی میں ہوتا ہے تو دُم اُٹھا کر اِدھر اُدھر بھاگتا ہے۔ یہ مہینہ اُونٹوں کی مستی اور بہار کا ہوتا تھا۔ اس مہینے میں ان پر ایک عجیب نشہ اور کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ صحراؤں میں مستیاں کرتے تھے، اسی مناسبت سے عرب کے بدّوؤں نے اس مہینے کا نام شوّال رکھ دیا۔ اس مہینے کا پہلا دن تمام مسلمانوں کے لیے بالعموم اور روزہ داروں کے لیے بالخصوص بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے اس دن تمام دنیا کے مسلمان انتہائی مسرّت کے ساتھ عید الفطر مناتے ہیں۔

۶ر شوال ۳ ھ کو مسلمانوں اور کافروں کے درمیان اُحد کے مقام پر دوسری جنگ ہوئی۔ جس میں پہلے تو مسلمانوں کا پلّہ بھاری تھا، مگر بعد میں بعض مسلمانوں کی غلطی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہو گئی۔

۱۱ر شوال ۸ ھ میں حُنین کے مقام پر قبیلہ ہوازن کے ساتھ مسلمانوں کا تاریخی معرکہ ہوا۔ بنو ثقیف، بنو سعد اور بنو ہلال بھی ہوازن کا ساتھ دے رہے تھے، لیکن خُدا کے فضل و کرم سے فتح مسلمانوں ہی کو ہوئی۔

۲۸ر شوال ۵ ھ میں غزوۂ احزاب ہوا، اس غزوہ میں عرب کے تمام بڑے بڑے قبائل اور سرداروں نے مل کر مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا۔ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے اِرد گرد گہری خندق کھدوائی جس کی وجہ سے کافر مدینہ میں داخل نہ ہو سکے، اور بالآخر وہ ذلیل اور نامُراد ہو کر واپس ہوئے۔ اس کے بعد کافروں کو کبھی بھی مُسلمانوں پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

سیّد کاشان جعفری

ایک ادیب کی سرگزشت

سنہ ۱۹۳۰ء کے دنوں کا ذکر ہے۔ لندن میں ایک ڈاکٹر صاحب رہا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی عمر کی ۳۴ منزلیں ہنستے مسکراتے طے کرلی تھیں۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی خوب دی تھی۔ جو مریض اُن کے شفاخانے میں دوا لینے آتا، چند ہی دنوں میں اس کی بیماری غائب ہو جاتی۔ مگر ان دنوں ڈاکٹر صاحب خود بیمار پڑ گئے۔ "چراغ تلے اندھیرا" والی بات صادق آئی اور بیچارے خود اپنا علاج نہ کر سکے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایک ہمعصر ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کرایا۔ اس ڈاکٹر نے مریض ڈاکٹر کا بڑے خلوص اور ہمدردی سے بغور معائنہ کیا، چند دوائیں لکھیں۔ ہدایات دیں اور رخصت کردیا۔ ان ہدایتوں میں ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ وہ چند ماہ کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر جاکر قیام کرے۔ اور یہ دن بے فکری اور سکون کے ساتھ گزارے۔

ڈاکٹر صاحب کوئی دیسی ڈاکٹر تو تھے نہیں، انگریز ڈاکٹر تھے۔ اور بہت ہی اصول پسند جب ان کے ہمعصر ڈاکٹر نے انہیں کسی صحت افزا مقام پر آرام کرنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے فوراً ہی پروگرام بنا لیا۔

گھر پہنچے، سفری سامان درست کیا۔ ٹریولر چیک بنوائے اور لندن کے ایک نواحی پہاڑی علاقے میں چلے گئے وہ بہت ہی خوبصورت گاؤں تھا۔ پہاڑی کے دامن میں سرسبز و شاداب کھیت تھے۔ چاروں طرف ہریالی تھی۔ اور خوبصورت خوش رنگ پھولوں کا راج تھا۔ انہوں نے گاؤں کی ہی ایک سلیقہ شعار، ادھیڑ عمر خاتون کو اپنے یہاں ماہانہ اُجرت پر کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور روزمرہ کی صفائی کے لئے رکھ لیا۔ وہ خاتون صبح سویرے آجاتی ڈاکٹر صاحب اس وقت چہل قدمی کے لئے نکل جاتے۔ ان کے واپس آنے تک وہ گھر کی صفائی کر کے ناشتہ تیار کر لیتی ڈاکٹر صاحب واپس آتے تو انہیں ناشتہ میز پر تیار ملتا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اخبار کے مطالعے میں مصروف ہو جاتے اس دوران، خاتون دوپہر کا کھانا تیار کر کے فریج میں رکھ دیتی اور اپنے گھر واپس جا کر اپنے شوہر کے لئے کھانا تیار کر کے فارم پر لے جاتی۔ اس کا شوہر ایک بڑا اچھا کسان تھا۔ اس نے بڑی محنت سے اپنے باپ دادا کی چھوڑی ہوئی بنجر زمین کو محنت کر کے کارآمد بنا لیا تھا۔ اب وہ سرسبز و شاداب فارم کی صورت میں اس کا ذریعہ معاش تھی۔ خاتون فارم سے واپس آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتی۔ اور پھر ڈاکٹر صاحب کے یہاں شام کے کھانے اور صفائی کے لئے آجاتی۔

ڈاکٹر صاحب چند دن تو بہت خوش و خرم رہے، مگر پھر وقت کے آرام سے اُکتا گئے، سوچنے لگے، کوئی اچھی سی مفید اور کارآمد مصروفیت اختیار کی جائے۔ شہر میں تو مریضوں کے درمیان بڑا مصروف وقت گزرتا تھا۔ جبکہ یہاں فرصت ہی فرصت تھی۔ سوچتے سوچتے انہیں یاد آیا کہ ایک بار انہوں نے ایک ناول لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اُس ناول کا وہ نام تک منتخب کر چکے تھے۔ پلاٹ بھی تیار تھا۔ آخر انہوں نے وہ ناول لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کاغذ قلم تیار کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔ قلم ہاتھ میں لئے وہ کافی دیر تک سوچتے رہے۔ یوں تین گھنٹے گزر گئے۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ ان کے سامنے پڑا کاغذ ابھی تک بالکل سادا تھا۔ ناول لکھنے کے لئے تین گھنٹوں میں وہ ابتدائی جملے تک نہ لکھ سکے تھے۔ بھوک سے بیتاب ہو کر انہوں نے قلم ایک طرف رکھا۔ اور دوسرے کمرے میں آکر فریج سے کھانا نکالنے کے بعد ہیٹر پر گرم کر کے وہیں بیٹھ کر کھانے لگے۔ کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔

سہ پہر کے بعد کام کرنے والی خاتون آگئی۔ اُس نے چائے بنا کر ڈاکٹر صاحب کو پلائی۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی، ڈاکٹر صاحب چائے پینے کے بعد پھر لکھنے کے لئے آ بیٹھے۔ اس بار انہوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ کئی جملے لکھے۔ پھر کاٹ دیئے، لکھے پھر کاٹ دیتے۔ آخر کافی جدوجہد کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک صفحہ لکھنے میں کامیاب ہو ہی گئے مگر وہ بھی اس طرح کہ جگہ جگہ لائنیں کٹی ہوئی تھیں۔ اس لکھے ہوئے صفحے کو انہوں نے دوبارہ صاف، صاف لکھا اور پھر لکھتے ہی چلے گئے۔

تین ماہ کی مدت ختم ہوئی تو ان کا ناول مکمل ہوا۔ انہوں نے تمام صفحات کو ترتیب دے کر یکجا کیا اور پڑھنے لگے۔ جوں جوں وہ ناول کا مطالعہ کرتے، چہرے پر ناگواری کے اثرات اپنا قبضہ جماتے جاتے، یہاں تک کہ ناول ختم ہوگیا۔ انہوں نے مسودہ نہایت بے دلی اور ناگواری سے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ایک طویل انگڑائی لیتے ہوئے وہ بستر پر لیٹ کر سوچنے لگے "یہ تین ماہ ناول لکھنے میں ضائع کرنے کے بجائے آرام کرنے میں گزارتے تو بیماری میں افاقہ تو ہوتا۔ ناول نگاری تو فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے جس کا ہمیں ماضی میں کوئی شوق نہیں رہا۔ طالب علم تھے تو تھیوری اور پریکٹیکل میں مصروف رہتے تھے۔ ڈاکٹر بنے تو مریضوں کو دیکھنے اور نسخے لکھنے میں وقت گزرا۔ ایسے لوگ بھلا کہاں ناول لکھ سکتے ہیں؟ اپنا لکھا جب خود کو ہی پسند نہ آئے تو قارئین بھلا کیوں پسند کریں گے۔"

کافی دیر تک ان کے ذہن میں اسی قسم کے خیالات گردش کرتے رہے۔ پھر وہ اُٹھے، غسل کیا اور کپڑے پہن کر چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکل گئے۔ راستے میں ان کی نظر اپنے یہاں کام کرنے والی خاتون کے شوہر مسٹر آگنس پر پڑی ڈاکٹر صاحب پگڈنڈی چھوڑ کر کھیت میں داخل ہوگئے اور کام میں مصروف مسٹر آگنس سے بڑی خوش دلی اور گرمجوشی سے ملاقات کی۔ دونوں وہیں کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگے۔

آگنس نے پوچھا "کیا بات ہے، گزشتہ دو تین ماہ سے آپ کے معمولات میں کچھ فرق آگیا ہے پہلے کی طرح شام کی چہل قدمی کرتے نظر نہیں آتے؟"

ڈاکٹر صاحب مسکرائے۔ پھر کہنے لگے "چلیے اب پھر نظر آنے لگوں گا۔ دراصل میرے ذہن میں ایک ناول کا خاکہ تھا یہاں فرصت ملی تو سوچا، اُسے لکھ ڈالوں۔ بس یہی مصروفیت تھی۔ آپ چہل قدمی کی بات کر رہے ہیں۔ ناول کی تصنیف میں تو میں کبھی کبھی کھانا، آرام کرنا اور سونا بھی بھول جاتا تھا۔ مگر جب ناول مکمل کرنے کے بعد خود اُسے پڑھنے بیٹھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ میں نے اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ ناول لکھنے میں۔ سو اسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور آئندہ ناول لکھنے کے خیال سے توبہ کرکے چہل قدمی کے لئے نکل پڑا۔ اب روزانہ چہل قدمی کیا کروں گا۔"

آگنس یہ سن کر حیرانگی سے بولا۔ "کیا کہا ڈاکٹر صاحب! آپ نے مسودے کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ آپ کو اپنے اُوپر اعتماد نہیں ہے.. اس زمین کو دیکھیے، جو آج ایک خوبصورت فارم کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ یہ نہایت بنجر اور پتھریلی تھی .. اس پر میرے دادا نے برسوں محنت کی۔ پھر میں نے اپنے والد کو محنت کرتے دیکھا اور ان کے بعد محنت کرنے کی ذمہ داری میں نے سنبھالی۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سرسبز و شاداب زمین کبھی بنجر اور ویران ہوا کرتی تھی۔؟... میرے خیال میں آپ نے بہت جلد ہمت ہار دی آپ دوبارہ محنت کریں ممکن ہے آپ کی

دوسری کوشش کامیاب ہوجائے۔ دوسری کوشش بھی ناکام ہوجائے تو تیسری کریں۔ الغرض کوشش اور جد وجہد سے مصروفِ عمل رہیں، یقیناً آپ ایک دن اپنے سنہرے خواب کی تعبیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ ناکامی آپ کا مقدر تو نہیں ہے... جب آپ اپنی لگن، جوش، شوق اور جد وجہد سے ایک اچھے ڈاکٹر بن سکتے ہیں، میں باپ دادا کی محنت پر مزید محنت کرتے ہوئے اس زرخیز فارم کا مالک بن سکتا ہوں تو آپ مصنف کیوں نہیں بن سکتے!"

ڈاکٹر صاحب کو آگنس کی باتیں دل میں اترتی.... محسوس ہوئیں۔ انہوں نے اپنے ذہن کو بھی آمادہ پایا۔ اور مسٹر آگنس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اس کی اس نصیحت پر ضرور عمل کریں گے۔ پھر اس ہمت افزائی پر شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

گھر واپس آکر ڈاکٹر صاحب نے ردّی کی ٹوکری سے مسوّدہ نکالا۔ اُس پر جگہ جگہ پانی کے دھبّے آگئے تھے جنہیں ہیٹر کی گرمی سے خشک کرکے انہوں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا اس بار ان کے مطالعے کی رفتار بہت مدّھم تھی۔ وہ تھوڑا تھوڑا پڑھتے، پھر اس پر غور و فکر کرکے از سرِ نو نئے صفحے پر لکھتے اس طرح تقریباً ۹۲ دن میں وہ اسے دوبارہ لکھنے میں کامیاب ہوگئے انہوں نے دوبارہ .... لکھے ہوئے مسوّدے کو پہلے خود پڑھا۔ پھر مسٹر آگنس کو مطالعے کے لئے دے دیا۔ مسٹر آگنس نے ناول پڑھا تو جوشِ مسرّت سے کھِل اُٹھا، مسکراتے ہوئے بولا "ڈاکٹر! یہ ایک مکمّل ناول ہے میں نہ کہتا تھا کہ کوشش کرنے سے ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ تم نے میرا مشورہ مان کر ہمیں ایک اچھا ناول دیا ہے۔ یہ ناول یقیناً تمہیں ایک ڈاکٹر کے مقابلے میں زیادہ مشہور و معروف شخصیت بنا دے گا۔"

دوسرے دن ڈاکٹر نے مسوّدہ ایک پبلشر کے پاس ڈاک کے ذریعے بھجوایا۔ چند ماہ تک وہ پبلشر کی طرف سے خط کا منتظر رہا۔ پھر لندن واپس چلنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

روانگی سے ایک دن قبل اُسے پوسٹ مین نے ایک خط لاکر دیا۔ اُس نے خط پڑھا تو خوشی سے کھِل اٹھا، خط اسی پبلشر کی طرف سے تھا۔ جس میں لکھا تھا۔ "ہم آپ کا ناول ہیٹرس کیسل (ہیٹر کا قلعہ) چھاپ رہے ہیں۔" آگنس کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ بھی خوشی سے جھوم اٹھا۔

ناول شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ ناقدین نے بھی اُسے خوب سراہا، ناول کو ڈرامے کے قالب میں ڈھالا گیا تو اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ ناشر کو کئی ایڈیشن چھاپنے پڑے۔ پھر اس کی مقبولیت انگلستان سے نکل کر دوسرے ممالک میں بھی پہنچنے لگی۔ ۲۴ غیر ملکی زبانوں میں اس کے ترجمے بڑے اہتمام سے شائع ہوئے۔ ایک فلم ساز ادارے نے اس کے حقوق فلم سازی کے لئے حاصل کرلئے اور ناشر کو اس ناول کی روز افزوں مقبولیت کی وجہ سے نہایت قلیل مدّت میں تین لاکھ نسخے شائع کرنے پڑے۔

اس ناول کی اشاعت اور پھر عالمی مقبولیت نے ڈاکٹر کی زندگی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا، کہاں تو وہ صحت یاب ہوکر دوبارہ اپنی پریکٹس شروع کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا اور اب کیفیت یہ تھی کہ دنیا اسے ایک اچھے نامور ادیب کی حیثیت سے جانتی تھی۔ کیا آپ جانتے ہیں، اُس ڈاکٹر مصنف کا نام کیا ہے۔؟ "ھیٹرس کیسل" اور "کیز آف دی کنگڈم" جیسی شہرہ آفاق تصانیف کے خالق کا نام آرکیبالڈ جوزف کرونن تھا جو اے جے کرونن کے نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوا۔ اے جے کرونن کو ادبی دنیا سے روشناس کرانے کا سہرا یقیناً اس ناشر کے سر ہے جس نے اس کا پہلا ناول شائع کیا۔ مگر حقیقتاً اس ناشر سے زیادہ اُس دیہاتی کسان کو اُس کا کریڈٹ ملنا چاہئیے۔ جس نے کرونن کو دوبارہ ناول لکھنے پر نہ صرف اُکسایا بلکہ مکمل طور پر آمادہ بھی کیا۔

۶ جنوری ۱۹۸۱ء کو ۸۴ سال کی عمر میں کرونن نے دائمی اجل کو لبیک کہا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام سوئٹزرلینڈ میں گزارے۔

انوکھے اور دلچسپ احتجاج

•۔ اگست ۱۹۵۱ء میں بینکوں کے ملازمین کی انجمن کی ہدایت پر ریزرو بینک آف انڈیا کی کلکتہ شاخ کے ۱۰۰۰ ملازمین نے احتجاج کے طور پر "ہم بھوکے ہیں" کے بیج لگانے شروع کر دیئے یہ بیج لگا کر وہ سارے شہر میں گھومتا رہتے۔

•۔ چند سال قبل فرانس میں ایک جگہ پھلوں کی کاشت کرنے والوں نے حکومت کی معاشی پالیسی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ایک اہم شاہراہ پر تقریباً بارہ ٹن آڑو اور ناشپاتیاں پھینک دیں، جس کے نتیجے میں ٹریفک جام ہوکر رہ گیا۔

•۔ پاکستان میں چند سال قبل ایک بینک کے ملازمین نے احتجاج کا ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے تمام کام بند کر دیا اور ہر شخص نے جو بھی چیز ملی، اسے بجانا شروع کر دیا تھا، کوئی میز بجا رہا تھا کسی کے ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ تھا کسی کو کچھ نہ ملا تو اُس نے مسلسل تالیاں بجانا شروع کر دیں غرضیکہ بینک میں داخل ہونے پر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ آتی جاتی چند رگیر روڈ پر راہگیروں کا ایک ہجوم بینک کے باہر کھڑا اس انوکھے احتجاج کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا اور یہ سلسلہ روزانہ کئی گھنٹوں تک جاری رہتا تھا۔ پاکستان ہی کے ایک دفتر میں لوگوں نے احتجاجاً بغیر قمیض کے، یعنی صرف پتلون اور بنیان میں دفتر آنا شروع کر دیا۔ اسی طرح ایک اور دفتر میں لوگوں نے احتجاجاً کھٹ پٹیاں / لکڑی کے کھڑاؤں / پہن کر آنا شروع کر دیا تھا۔ طاہرہ علی سحر ــــ ملیر ہالٹ، کراچی

خود غرضی کی سزا

عبدالعزیز خالد

اِک گدھا اور ایک گھوڑا
کر رہے تھے اپنے مالک کی معیّت میں سفر
"جان میری گر بچانا چاہتے ہو
تو بٹاؤ بوجھ کچھ میرا"..... گدھے نے
ہانپتی سانسوں سے گھوڑے سے کہا۔
بے رُخی بَرتی مگر گھوڑے نے، بیچارہ گدھا
آخر تھکن سے چوُر ہو کر گر گیا اور مر گیا
رکھ دیا تب بوجھ سارا اُن کے مالک نے اُٹھا کر
پیٹھ پر گھوڑے کی، لو!
اور ساتھ اُس کے گدھے کی کھال بھی!

آہ گھوڑے نے بھَری
اور کھینچی اِک صدائے دردناک
"افسوس در افسوس!
ڈالا کس مصیبت میں مری بیجا اکڑ فوں نے مجھے!
بوجھ تھوڑا سا اُٹھانے سے کیا انکار... میں نے
اس کی اب پاداش میں، مجھ کو نہ صرف
بارِ خر سارا اٹھانا پڑ رہا ہے۔
بلکہ اُس کی کھال بھی!
بن گئی آخر وبالِ دوش خود غرضی مری!"
سَبَق: جو ہو طاقتور اسے امداد کرنی چاہیئے کمزور کی
زندگی محفوظ رہ سکتی ہے دونوں کی یوں ہی!

یہ تصویر کس کی ہے ___؟

یہ ایک مشہور و معروف شخصیت کے بچپن کی تصویر ہے۔ اسے غور سے دیکھئے اور پہچاننے کی کوشش کیجیے۔ کیا آپ نے پہچانا؟ چلیئے ہم آپ کو کچھ اشارے دیتے ہیں۔ یہ ایک اسلامی ملک کی اہم شخصیت ہیں۔ ان کو بچوں سے بہت پیار ہے اور یہ مختلف اہم ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ ان اشاروں کی مدد سے شخصیت بوجھ کر ہمیں ۲۰ر جون ۱۹۸۸ء تک جواب ارسال کر دیں۔ درست جواب دینے والے ساتھی کو ایک خوبصورت انعام دیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ حل ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہو گا۔

سیّد عروج علی یوسف

سُونڈ ہاتھی کی!

بھیّے! کبھی تم نے سوچا کہ ہاتھی کی سونڈ کیسے بنی؟ تم دیکھتے ہو کہ ہاتھی اپنی سونڈ سے کیسے بڑے بڑے کام لیتا ہے. مثلاً یہ سونڈ اس کی ناک بھی ہے اور وہ اس سے چیزوں کو سونگھتا ہے. اس سے سانس لیتا ہے. سونڈ کی مدد سے وہ چیزیں پکڑ کر زمین سے اٹھاتا ہے اور جب اُسے دوسرے جانوروں سے لڑائی کرنا ہو تو اس وقت وہ اپنی سونڈ کو ہتھیار کے طور استعمال کرتا ہے.

ہزاروں سال پہلے کی بات ہے. اس زمانے میں ہاتھی کی ناک اتنی لمبی نہیں ہوتی تھی جتنی کہ آج کل ہوتی ہے. افریقہ میں ہاتھی کا ایک بچّہ رہتا تھا، یہ ہاتھی بچّہ بے حد ذہین اور شرارتی تھا اور دوسرے ذہین اور شریر بچّوں کی طرح اس کا کام دن بھر اپنے بڑوں سے مختلف چیزوں کے بارے میں سوالات

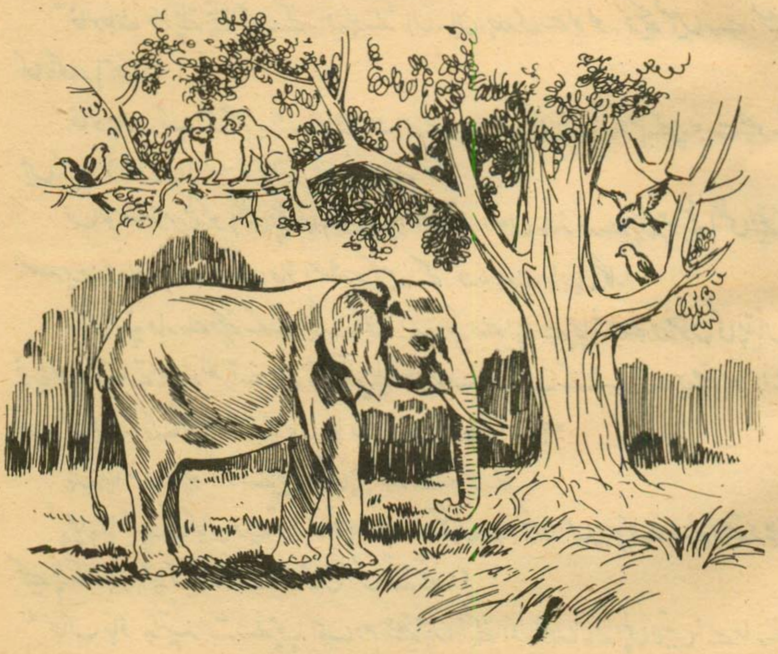

کرتے رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنے سارے اور اتنے مشکل سوال کرتا تھا کہ اس کے بزرگ جواب دیتے دیتے تنگ آجاتے تھے۔ اور اگر وہ ان کے ڈانٹنے پر خاموش نہیں ہوتا تھا تو پھر اس کی خوب پٹائی لگتی تھی۔

ایک دن صبح صبح اس کے ذہن میں ایک نیا سوال آیا۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے اپنی امی جان کے پاس گیا اور ان سے کہا "امی۔ امی یہ بتایئے کہ مگرمچھ رات کے کھانے میں کیا کھاتا ہے ؟" اس کی امی نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسے گھورا پھر غصے میں بولی "منے۔ یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ تم دیکھ نہیں رہے کہ میں تمہارے آبا کے لئے کھانا تیار کر رہی ہوں۔" پھر امی نے اسے مارنے کے لئے اپنے اگلے پاؤں اٹھائے۔ لیکن وہ پہلے ہی بھاگ نکلا۔ اب وہ اپنے خالو یعنی شترمرغ کے پاس آیا۔ شترمرغ اپنی دُم پُھلا پُھلا کر جھاڑیوں کے درمیان پُھدک رہا تھا۔ اس کے پورے جسم پر بڑے خوبصورت اور چمکیلے پر تھے لیکن دُم کے پر بہت چھوٹے تھے اور کچھ نُچے ہوئے لگتے تھے۔

ہاتھی بچّہ اپنا پہلا سوال بھول گیا اور بولا "خالو جان، خالو جان۔ ایک بات بتایئے۔"

"خالو جان دانہ چگتے چگتے رک گئے۔ اور بولے" ہاں، ہاں، جلدی سے بولو۔ دیکھ نہیں رہے۔ میں کھانا کھا رہا ہوں۔"

"خالو جان۔ آپ کے جسم پر بڑے خوبصورت اور لمبے لمبے پر ہیں لیکن آپ کی دُم کے پر بہت چھوٹے ہیں۔ کیا لڑائی میں کسی دوسرے جانور نے نوچ لئے "؟

خالو شترمرغ کو ہاتھی بچّے کی بات پر بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے زور سے اپنی چونچ ہاتھی بچّے کے سر پر ماری اور بولے "بھاگ جاؤ! شریر کہیں کے۔ ورنہ بہت ماروں گا۔"

ہاتھی بچّہ مار سے بچنے کے لئے بھاگ نکلا۔ ایک جگہ اسے اپنے لمبے چچا زرافے درختوں کی پتیاں نوچ نوچ کر کھاتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ہلکے پیلے جسم پر سیاہ رنگ کے بڑے بڑے دھبّے اور داغ تھے۔ ہاتھی بچہ فوراً رک گیا اور بولا "چچا جان، چچا جان۔ ایک بات بتایئے ؟"

"ہاں بیٹا ضرور پوچھو" زرافے چچا پتیاں چباتے ہوئے بولے۔

"چچا، چچا آپ کی کھال ویسے تو بڑی خوبصورت، اور چمکیلی ہے۔ لیکن اس پر یہ کالے کالے دھبّے دھبّے کیسے پڑ گئے ہیں۔ کیا آپ کوئلے کی کان میں گھس گئے تھے "؟

"بھاگ جاؤ بدتمیز" زرافے چچا ایک دم غصّے میں آگئے اور انہوں نے اپنی لاتیں اُسے مارنے

کے لئے اٹھائیں" ہاتھی بچّہ مار سے بچنے کے لئے وہاں سے بھاگا تو اسے ایک جگہ اس کے بالڈر چچا بندر نظر آئے جو ایک درخت کے نیچے گرے پڑے ناریل اُٹھا اُٹھا کر پھوڑ رہے تھے اور اندر کا گودا مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

ہاتھی بچّے نے چچا بندر کو دیکھا تو سوچنے لگا چچا آج درخت پر چڑھ کر ناریل کھانے کے بجائے نیچے گرے ہوئے ناریل پر کیوں گزارا کر رہے ہیں۔ پھر چچا بندر سے بولا "چچا جان۔ ایک بات بتایئے"؟

"ہاں، ہاں بوبو! بیٹا" چچا خوخیاتے ہوئے بولے۔

"چچا جان، چچا جان، آج آپ اُوپر چڑھ کر تازہ ناریل کھانے کے بجائے نیچے گرے ہوئے باسی ناریل کیوں کھا رہے ہیں"؟

چچا ایک دم غصّے میں آ گئے۔ اور اس کے ایک زوردار نچپ مار کر بولے "بدتمیز۔ دیکھتا نہیں کہ ہمارے پیر میں موچ آ گئی ہے۔ بھاگ یہاں سے ورنہ اور ماروں گا۔"

ہاتھی بچّہ وہاں سے بھاگا تو سیدھا اپنی امی جان کے پاس پہنچا۔ اس کی امی لمبی لمبی گھاس پر منہ مارنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے پیار سے اسے اپنے پاس بلایا اور تازہ تازہ گھاس پیش کی۔ کچھ دیر وہ گھاس کھاتا رہا جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اسے یاد آیا کہ اس کی کوئل خالہ دور دور کی سیر کرتی ہیں وہ یقیناً بتا سکیں گی کہ مگرمچھ رات کے کھانے میں کیا کھاتا ہے؟

کوئل خالہ جنگل میں ایک درخت پر بیٹھی کوک رہی تھیں۔ ہاتھی بچّہ ان کے پاس پہنچا اور بولا "خالہ جان، خالہ جان۔ ایک سوال پوچھوں۔ ماریں گی تو نہیں"؟

"نہیں بیٹا، شوق سے ایک چھوڑ دس سوال پوچھو"

"خالہ جان۔ یہ بتایئے کہ مگرمچھ رات کے کھانے میں کیا کھاتا ہے"

"خالہ جان سوال سُن کر سوچ میں پڑ گئیں پھر بولیں" تم بہت شریر ہو۔ بھئی اس سوال کا جواب تو مگرمچھ خود ہی دے سکتا ہے کہ وہ رات کے کھانے میں کیا کھانا پسند کرتا ہے؟"

"خالہ جان۔ مگرمچھ کہاں رہتا ہے؟"

"یہاں سے مشرق کی طرف ایک بہت بڑا دریا ہے۔ مگرمچھ وہاں رہتا ہے۔"

ہاتھی بچّہ مگرمچھ سے ملنے کے لئے مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ جنگل کافی گھنا تھا۔ دھوپ چھن چھن کر بمشکل زمین تک پہنچ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے جانور ہاتھی بچے سے ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور وہ

جھومتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہوا سیلی ہوگئی اور مچھروں کے غول کے غول نظر آنے لگے تھوڑی دیر میں پانی بہنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ دریا قریب آگیا تھا۔ دریا کے قریب اس نے جو جانور سب سے پہلے دیکھا وہ ایک آبی سانپ تھا جو ایک درخت کی شاخ سے لٹک رہا تھا۔ ہاتھی بچّہ اس کے قریب رک گیا اور بولا۔ "چچا جان، چچا جان۔ کیا آپ کا نام مگرمچھ ہے" ؟

" بدتمیز " آبی سانپ نے دُم زور سے ہاتھی بچّہ کے منہ پر ماری "میں آبی سانپ ہوں اور سانپوں کا سردار ہوں۔ بھاگ جاؤ"

ہاتھی بچّہ آگے بڑھا تو دریا آگیا۔" دریا کے کنارے ایک جانور آدھا پانی میں ڈوبا اپنا سر پانی سے باہر نکالے بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا یہ مگرمچھ تھا۔

"چچا جان، چچا جان" ہاتھی بچے نے اسے آواز دی، مگرمچھ نے ایک آنکھ کھول کر .... دیکھا تو سامنے ایک موٹے تازے ہاتھی بچے کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ لیکن ہاتھی بچّہ اس سے کافی فاصلے پر تھا اور وہ اسے پکڑ کر شکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کاہلی سے بولا "کیا بات ہے بھئی۔ کیوں تنگ کر رہے ہو۔"

"چچا جان، چچا جان ، کیا آپ نے مگرمچھ کو دیکھا ہے "؟

چچا مگرمچھ نے اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں۔ ہاتھی بچے کو گھور کر دیکھا۔ پھر بولا "کیوں تمہیں مگرمچھ سے کیا کام ہے "؟

" میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ رات کے کھانے میں کیا کھانا پسند کرتا ہے"، ہاتھی بچے نے کہا۔

" رات کے کھانے کا نام سن کر مگرمچھ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ دل ہی دل میں بولا۔

"رات کے کھانے میں ہاتھی بچے کا گوشت کھانے کو ملے تو مزہ آجائے۔ لیکن کیسے ؟"

پھر وہ ہاتھی بچے سے بولا " میاں صاحب زادے۔ آپ میرے قریب آئیں تو میں چپکے سے آپ کے کان میں بتاؤں کہ مگرمچھ رات کے کھانے میں کیا پسند کرتا ہے ؟ "

" اچھا" ہاتھی بچہ جواب سن کر خوش ہوگیا۔ اور اس نے دریا کے کنارے پڑ کر اپنا کان مگرمچھ کے بالکل قریب کر دیا۔ مگرمچھ نے ہاتھی بچے کو اتنے قریب دیکھا تو اپنی جگہ سے اچھلا اور ہاتھی بچہ کا کان پکڑنے کی کوشش کی۔ ہاتھی بچّہ مگرمچھ کے رات کے کھانے کے بارے میں سوال پوچھ کر بہت سارے

بزرگوں سے مار کھا چکا تھا اس لئے بے حد محتاط تھا۔ چنانچہ اس نے فورًا اپنا کان پیچھے کر لیا۔ مگرمچھ اس کا کان تو نہ پکڑ سکا لیکن اس کی ناک کی نوک اس کے منہ میں آگئی جسے اس نے زور سے پکڑ لیا

" ہاتھی بچہ زور سے چلایا" چچا جان، چچا جان، مجھے چھوڑ دیئے۔ میری ناک ٹوٹ جائے گی۔"

مگرمچھ اس کی ناک پکڑے پکڑے بولا۔" میں رات کے کھانے میں ہاتھی بچے کو کھانا پسند کرتا ہوں۔"

یہ سن کر تو ہاتھی بچے کی جان نکل گئی۔ اس نے اپنی ناک چھڑانے کے لئے پورا زور لگایا۔ اِدھر مگرمچھ نے اس کی ناک کو پوری طاقت سے پکڑ کر کھینچا۔ دونوں میں خوب زور آزمائی ہونے لگی۔ آبی سانپ بھی اس زور آزمائی کو دیکھنے کے لئے قریب آگیا۔

جنگل کے دوسرے چھوٹے بڑے جانور، خرگوش، گلہریاں اور چوہے وغیرہ بھی اس لڑائی ——————— کا منظر دیکھنے کے لئے باہر نکل آئے۔ کبھی مگرمچھ ہاتھی بچے کو پانی کے اندر کھینچ لیتا اور کبھی ہاتھی بچہ مگرمچھ کو باہر کھینچ لاتا۔ اس کھینچا تانی میں ہاتھی بچے کی ناک جو پہلے ایک جوتے سے زیادہ بڑی نہیں تھی کھنچ کر کافی لمبی ہوگئی۔ سب جانور خرگوش اور گلہریاں وغیرہ زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ ہاتھی بچہ جب اپنی ناک چھڑانے میں ناکام رہا تو مدد کے لئے چلایا۔ تماشا دیکھنے والے سب جانوروں کی ہمدردیاں ہاتھی بچے کے ساتھ تھیں کیونکہ مگرمچھ ان چھوٹے چھوٹے جانوروں کو بغیر ڈکار لئے ہضم کر جاتا تھا لیکن وہ ہاتھی بچے کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔

جب ہاتھی بچے نے دیکھا کہ سب چھوٹے جانور مگرمچھ سے ڈرتے ہیں تو چلایا۔" چچا سانپ، چچا سانپ، مجھے بچایئے۔"

آبی سانپ بولا" تم نے دیکھا۔ مگرمچھ کتنا خراب جانور ہے اور تم نے مجھے مگرمچھ کہا تھا۔

"چچا جان۔ مجھے معاف کر دیجئے"۔ ہاتھی بچے نے کہا۔

آبی سانپ نے یہ سن کر اپنی دم پوری طاقت سے مگرمچھ کے ماری۔ مگرمچھ نے ہاتھی بچے کی ناک فورًا چھوڑ دی اور دریا میں غوطہ لگا گیا۔

ہاتھی بچہ فورًا دریا کے کنارے سے دور ہوگیا کہ کہیں مگرمچھ دوبارہ اس کی ناک نہ پکڑ لے۔

" بیٹا" آبی سانپ بولا" جاؤ! تم اب اپنے گھر جاؤ"

ہاتھی بچہ بولا" چچا جان۔ میں اپنے گھر نہیں جا سکتا میری ناک اتنی لمبی ہوگئی ہے کہ میری امی

میری پٹائی لگائیں گی۔ میں اپنی ناک کے سکڑنے کا انتظار کروں گا۔"

"بیٹا" آبی سانپ نے کہا۔ "اللہ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے بعض اوقات کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا چیز اس کے لئے اچھی ہے اور کیا چیز بری۔ تمہیں اپنی شکل کے بگڑ جانے پر افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔"

لیکن ہاتھی بچہ مسلسل اپنی ناک لمبی ہو جانے پر افسوس کرتا رہا۔ اچانک کہیں سے ایک مکھی اڑتی ہوئی آئی اور اس کے سر پر بیٹھ گئی۔ ہاتھی بچے نے مکھی کو اڑانے کے لئے اپنی ناک ہلائی جو اب سونڈ بن چکی تھی۔ مکھی سونڈ کی زد میں آکر وہیں گر پڑی۔ "تم نے دیکھا" آبی سانپ بولا۔ "آپ تمہاری ناک کتنی کارآمد ہو گئی ہے۔ اچھا اب دکھ مت کرو اور کچھ کھالو" یہ کہہ کر آبی سانپ نے ایک درخت پر لگے ہوئے کچھ پھلوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ پھل کافی بلندی پر لگے ہوئے تھے اور ہاتھی بچہ ان کے قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اچانک اس نے اپنی سونڈ اٹھائی اور کئی پھل توڑ ڈالے۔ اب اسے اپنی سونڈ کا اصل فائدہ معلوم ہوا۔ اس نے دریا کے کنارے رہنے والے چھوٹے جانوروں اور آبی سانپ کو خدا حافظ کہا اور واپس اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ◻

حق اسکواڈ

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلہ تحریر
اخلاق احمد کی مہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

قیمت صرف ۱۰ روپے

- برائیوں سے برسرِ پیکار کمسن مجاہدوں کے کارنامے۔
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات۔
- خوبصورت اسکیچز — بہترین کتابت — اعلیٰ طباعت
- حسین سرورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات۔
- حق اسکواڈ کے حصول کے لئے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوادیں۔
- دوکاندار اور ایجنٹ حضرات آرڈر سے مطلع کریں۔

پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی۔ ۱۱۲ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

قرۃ العین سلیم

پی چو کی ڈائری

۲/اپریل ۱۹۸۸ء

میں روز ڈیڈی سے کہا کرتا تھا نیا سال شروع ہو چکا۔ پچھلی ڈائری پرانی ہو گئی نئی لا دیجیے۔ ڈیڈی روز وعدہ کر کے بھول جاتے، مگر کل میری سالگرہ ہے۔ ڈیڈی نے ایک سرمئی اور سنہرے رنگ کی ڈائری تحفے میں دی ہے جس کے کناروں پر بیلیں بنی ہیں اور اندر صفحات پر تتلیوں اور پھولوں کی تصویریں بھی ہیں۔ میں بہت خوش ہوا اور ڈیڈی کو تھینک یو کہا۔ ممی اور ڈیڈی کا موڈ بھی آج بہت اچھا تھا۔ ممی نے ابھی مجھے سالگرہ کا تحفہ نہیں دیا مجھ سے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ کہہ رہی تھیں کل دیکھئے گا۔ مگر میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ نیلا ڈبہ کھول کر دیکھوں جس میں میرا تحفہ بند ہے۔ مگر ممی نے کہا پی چو تھوڑا سا انتظار کرو، کل تو ابھی منٹوں میں آ جائے گی، بالکل چٹکی بجاتے۔ ممی کی بات پر ڈیڈی بہت ہنسے

اور کہا وقت کے بارے میں تمھارا سسٹم کچھ گڑ بڑ ہے ۔ صبح پی چو کو اُٹھاتی ہو تو کہتی ہو بیٹا اُٹھو! دوپہر سر پر آگئی اور جب وہ دوپہر کا کھانا مانگتا ہے تو اُسے ڈانٹتی ہو کہ تمھیں تو صبح ہی صبح بھُوک لگ جاتی ہے ۔ ممّی بھی ہنس دیں اور کہا خیر، بات کا لطیفہ تو مت بنایئے ۔ اسی وقت نُونُو نے رونا شروع کر دیا ۔ اور ممّی اُسے لان میں ٹہلانے لے گئیں ۔ ڈیڈی انگریزی کی موٹی سی کتاب پڑھنے لگے اور میں اپنے کمرے میں آگیا ۔ دل چاہ رہا ہے کہ کل جلدی سے آجائے ۔ رات کے سوا دس بج چکے ہیں ۔ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی ہیں ۔ اب سو جانا چاہیئے ۔

۴؍اپریل

آج صبح ہی صبح ممّی نے مجھے اُٹھا دیا اور کہا ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ۔ پی چو بیٹا! جلدی سے اُٹھ جاؤ ۔ ویسے روز میں ذرا آنکھیں موندے لیٹا رہتا ہوں پھر دو چار کروٹیں بدلتا ہوں، تب بستر سے اُٹھتا ہوں، مگر رات مجھے سونے سے پہلے یاد تھا کہ ہمیشہ کی طرح صبح ممّی کے ہیپی برتھ ڈے کہنے پر آنکھ کھُلے گی ۔ اور یہی ہوا ۔ سرہانے ہی میرا تحفہ رکھا تھا ۔ ممّی نے کہا جلدی سے کھولو ۔ ڈبّے میں سے ایک پیارا سا ٹیمبل کلاک نکلا ۔ جس کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ کانوں پر ہتھوڑے برساتی الارم کی آواز کے بجائے چڑیا چہچہاتی تھی ۔ اتنی نرم اور خوبصورت آواز میں کہ مجھے اُٹھانے کے بجائے میری نیند گہری ہی نہ کر دے ۔ پتا نہیں ۔ کس وقت ممی اور ڈیڈی نے میرا کمرہ بھی سجا دیا تھا ۔ سارے کمرے میں لال، نیلے، پیلے، فیروزی ربن ہولے سے لہرا رہے تھے اور بہت اچھے لگ رہے تھے ۔ صرف غبارے لگانا باقی تھے ۔ جو میں خود شام کو دوستوں کے ساتھ مل کر لگایا کرتا ہوں ۔ اگر غبارے پہلے سے لگا دیے جائیں تو عجیب پیلے سے ہو جاتے ہیں اور بُرے لگتے ہیں ۔

شام کو جب کیک کٹا اور سب دوستوں نے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو گایا ۔ ۔ ۔ تو مجھے بہت اچھا لگا ۔ نُونُو نے بھی سب کے ساتھ تالیاں بجائیں اور اُچھل اُچھل کر خوشی کا اظہار کیا ۔ جب نومی اور اسد نے سالگرہ کی جوکروں والی ٹوپیاں پہن کر سیٹیاں بجائیں تو نُونُو بہت ہنسی ۔ ہنستے ہوئے اس کے دو چھوٹے چھوٹے دانت نظر آرہے تھے جو ابھی کچھ روز پہلے نکلے تھے اور گالوں میں گڑھے سے پڑ جاتے ڈیڈی نے بہت سی تصویریں کھینچیں اور ممّی نے کینو، کیلے، پیسٹری، پیٹز اور گلاب جامن سے سب دوستوں کی تواضع کی ۔ دوستوں نے مجھے بہت اچھے اچھے تحفے دیے ہیں جو میں نے اپنے شوکیس میں سجا لیے ہیں ۔

آج ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی جب میں نے کیک میں دس موم بتیاں لگائیں تو ممی نے ایک موم بتی نکال لی اور کہا یہ تمھاری نویں سالگرہ ہے۔ پچھلے سال بھی میں نے نویں سالگرہ منائی تھی میں نے ممی کو یاد دلایا۔ مگر ممی نے ڈانٹا اور کہا تم کتنے سال کے ہوگئے ہو یہ ممی کو یاد ہوگا یا بیٹے کو؟ ممی ٹھیک کہتی ہیں۔ بھلا مجھے کیا یاد ہوگا کہ میں کب پیدا ہوا تھا۔ اس وقت تو میں بہت چھوٹا تھا۔ ویسے مجھے یہ بات یاد ہے کہ جب میں نونو کے برابر تھا چلنا بھی نہیں آتا تھا تب ایک بار میں واٹر بال پر بیٹھ گیا تھا اور جب وہ زور سے پھٹا تو میں ڈر کے بہت رویا۔ ڈیڈی کہتے ہیں ایسا ہُوا تو تھا مگر ممی نہیں مانتیں، کہتی ہیں پی چو کو کیا یاد ہوگا۔ یہ تو بہت چھوٹا تھا، مگر مجھے سچ مچ یہ بات یاد ہے، خیر! میں ممی سے بحث تو نہیں کرسکتا مس نغمہ کہتی ہیں اچھے بچے بڑوں سے بحث نہیں کرتے۔ ممی ابھی کمرے میں آئی تھیں کہہ کر گئی ہیں پی چو فٹافٹ سو جاؤ اب تک کیوں جاگ رہے ہو؟ اس لیے اب میں سونے جا رہا ہوں صبح اسکول بھی جانا ہے۔

۷ر اپریل

آج مجھ سے ایک چائے دانی ٹوٹ گئی۔ بے چاری ممی نے رضیہ آنٹی سے فرانس سے منگوائی تھی پتا نہیں اتنی دُور سے کیوں حالانکہ ایسی چائے دانیاں تو بازار میں ہر جگہ ملتی ہیں۔ خاصی ڈانٹ پڑی۔ ممی اور ڈیڈی جب کبھی کسی بات پر ڈانٹتے ہیں تو آپ آپ کہہ کر ڈانٹتے ہیں۔

پی چو آپ بہت شریر ہوگئے ہیں۔ پی چو آپ بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہیں۔ ہاں بدتمیز سے یاد آیا۔ اُس دن جب ہم خالہ جان کے گئے تھے اور اُن کی ماسی چپل پہن کر ڈرائنگ روم کے قالین پر چڑھ گئی تھی۔ تو خالہ جان نے اُس سے کہا تم بہت بدتمیز ہوگئی ہو چپل پہن کر قالین پر چڑھ گئیں۔ اس وقت ہم سب بھی قالین پر جوتوں سمیت موجود تھے۔ میں نے کہا یوں تو ممی، ڈیڈی، خالو جان بھی بدتمیز ہوگئے۔ ہے نا؟ ممی نے بہت خفگی سے گھورا اور خالو جان میز سے رسالہ اُٹھا کر پڑھنے لگے۔ کسی نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بس خالہ جان نے کہا پی چو بہت شریر ہوگیا ہے۔

ایک چائے دانی کیا ٹوٹ گئی ممی نے بیٹ اور بال اسٹور میں بند کردی۔ ممی خود ہی تو گھر سے نکلنے نہیں دیتیں۔ میں اکیلا ہی کرکٹ کھیلتا رہتا ہوں۔ ون مین شو۔ اُس وقت جو میں نے ہلکا سا شارٹ مارا تو بال سیدھی میز پر اور چائے دانی زمین پر۔ ممی نے ناراضگی سے کہا پی چو آج آپ نے چائے دانی بھی شہید کردی۔ سویٹ ممی، شہید تو صرف انسان ہوتے ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ایک لمحے کے لیے ممی کے

چہرے پر مُسکراہٹ آئی اور پھر چھُپ گئی اور ممّی نے غصّے سے کہا بس پی چو آج سے آپ کی کرکٹ ختم۔

ٹی وی پر جاوید میانداد بچوں کو انٹرویو دیتے ہوئے بتا رہے تھے کہ بچپن میں کرکٹ کھیلتے ہوئے اُن سے بھی بہت چیزیں ٹوٹ جایا کرتی تھیں اور امّی ابّو کی ڈانٹ پڑا کرتی۔ مجھے لگتا ہے بچپن میں سب ہمارے جیسے ہی ہوتے ہوں گے۔ ڈیڈی بھی خوب پتنگ اُڑاتے ہوں گے اور دادا ابّا کی ڈانٹ پڑتی ہوگی۔ کرکٹ کھیلتے ہوئے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ جاتا ہوگا تو دادی اماں بیٹ اور بال چھُپا دیتی ہوں گی۔ اور سر ابرار جو گولا گنڈا کھانے پر دھوپ میں کھڑا کر دیتے ہیں خود بچپن میں گولا گنڈا کھانے پر دھوپ میں کھڑے ہونے کی سزا پاتے ہوں گے، اور کبھی حساب کا سوال غلط کرنے پر ہماری طرح مُرغا بھی بنتے ہوں گے۔ مگر ویسے سب بڑے کہتے ہیں کہ ہم آج کل کے بچوں کی طرح شریر اور بدتمیز نہیں تھے۔ پتا نہیں پھر بے چارے اپنے بچپن میں کیا کرتے ہوں گے؟

۱۰ر اپریل

اسد کی بہن صوفیہ ہے تو بہت چھوٹی ابھی کے جی میں پڑھتی ہے۔ مگر ممّی سے اُس کی بڑی پکّی دوستی ہے۔ آج وہ ممّی کے لیے گلاب کے کچھ پھول لے کر آئی تھی۔ ممّی بہت خوش ہوئیں کیونکہ ان کو پھول بہت پسند ہیں۔ صوفیہ نے ممّی سے کہا "آنٹی آپ کو پھول بہت پسند ہیں نا؟"

ممّی نے جواب دیا "ہاں کیوں نہیں پھول اور بچے تو سب کو پسند ہوتے ہیں۔"

"کیونکہ بچے بھی تو پھول ہوتے ہیں۔" صوفیہ نے ٹافی منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی بات پر ممّی بہت ہنسیں کہ نونو کی طرح گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ ممّی کے گالوں میں بھی ہنستے ہوئے نونو کی طرح گڑھے سے پڑ جاتے ہیں۔ ممّی نے کہا۔

"ارے تمھیں یہ بات کس نے بتائی؟"

"کسی نے نہیں یہ تو ٹی وی اور ریڈیو پر بتاتے ہیں۔" اُس نے ٹافی چباتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ہاں ٹی وی اور ریڈیو پر تو یہ بتاتے ہی ہیں۔ کوئی خاص عقلمندی کی بات تو اُس نے نہیں کی۔ مگر ممّی نے اُس سے کہا "بھئی تم تو بہت ذہین ہو۔" شاید ایسے ہی حوصلہ افزائی کے لیے کہا ہوگا۔ ممّی کہتی ہیں بچوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔

۱۱ر اپریل

آج ڈائری لکھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ ڈائری لکھنا اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ جتنا لکھنے کے بعد اُسے

چھپاکر رکھنا۔ کیوں کہ گھر میں جو بھی آتا ہے میری چیزیں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے: "دیکھیں تو بھئی ہمارے پی چو میاں! کیا لکھ پڑھ رہے ہیں۔ ارے پی چو! یہ تصویر تم نے بناتی ہے" "بھئی پی چو تم کتابوں کو سلیقے سے کیوں نہیں رکھتے"۔ پتا نہیں آنے والوں کو میری میز سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو جاتی ہے اِسی لیے میں اپنی ڈائری چھپا کر رکھتا ہوں۔ کل ہی کی بات ہے ہماری ایک کزن آئیں، عمر میں مجھ سے بڑی ہیں۔ میری ڈائری میز پر رکھی ہوئی تھی۔ آتے ہی انھوں نے جھپٹ کر ڈائری اٹھالی "ارے پی چو! تم ڈائری لکھتے ہو؟"

"دیکھئے آپ اِسے ہرگز نہیں پڑھیں گی" میں اُن کی طرف لپکا۔ مگر وہ تیزی سے میز کی دوسری طرف چلی گئیں "نہیں میں تو اسے ضرور پڑھوں گی"!

"امّی دیکھئے! شہلا آپی کو منع کیجئے۔ یہ میری ڈائری پڑھنا..." میں چیختا ہوا ان کی طرف بھاگا۔ لیکن وہ سارے گھر میں بھاگتی پھریں۔ وہ آگے آگے اور میں اُن کے پیچھے پیچھے۔ میں سوچتا ہوں اتنی بڑی ہونے کے باوجود ان میں ذرا ایٹی کیٹ نہیں۔ اتنی سی بات انھیں نہیں معلوم کہ دوسروں کی ڈائری پڑھنا، دوسروں کے خطوط پڑھنا نہایت بُری بات ہوتی ہے۔ میں تو امّی سے بھی ناراض ہوں کیونکہ انھوں نے بجائے شہلا آپی کو منع کرنے کے اُلٹا مجھے کہنا شروع کر دیا کہ "پڑھنے دو، اس میں ایسی کیا راز کی بات تم نے لکھی ہے"! اس لیے اب میں نے سوچا ہے کہ آئندہ ڈائری نہیں لکھوں گا اور جتنا کچھ لکھ لیا ہے اُسے جلا دوں گا۔

آنکھ مچولی کے پرانے شمارے کیسے منگائیں؟

ہمیں بے شمار بچّوں کے ایسے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں انہوں نے 'آنکھ مچولی' کے پرانے شمارے بھیجنے کی فرمائش کی ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی "آنکھ مچولی" کی البم مکمّل کر سکیں۔
جو ساتھی پرانے شمارے منگانا چاہتے ہیں وہ فی شمارہ ۵ روپے اور سالنامہ و خاص نمبر ۱۰ روپے کی شرح سے ماہنامہ 'آنکھ مچولی' کے پتہ پر منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر روانہ کردیں۔ انہیں مطلوبہ شمارے فوراً روانہ کردیئے جائیں گے

پہچانیے!

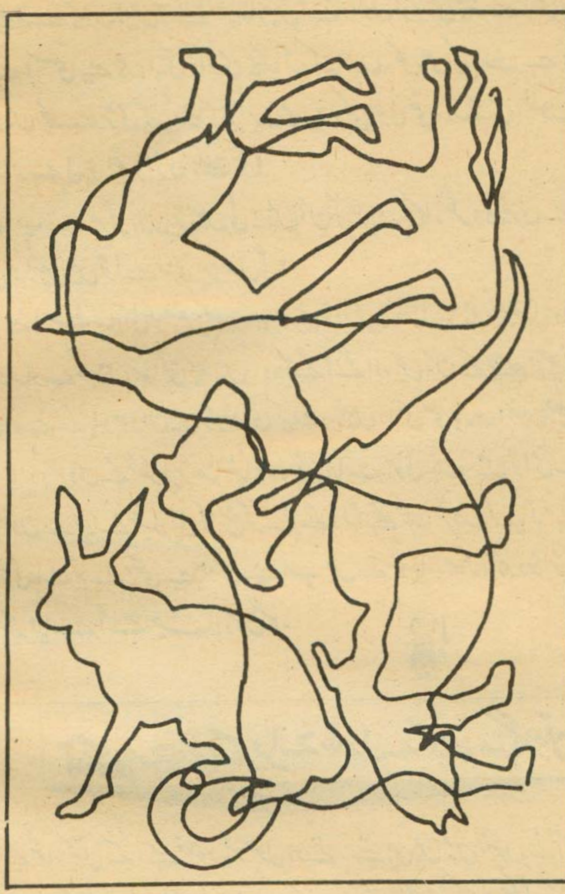

اس تصویر میں بہت سے جانور اس طرح گتھم گتھا ہو گئے ہیں کہ ان کا پہچاننا مشکل ہے۔ کیا آپ ان جانوروں کو الگ الگ پہچان سکتے ہیں۔

سید خورشید عالم

لوہے کا قلعہ

انسان کی فطرت میں لڑائی جھگڑے کا مادہ اُسے نت نئے ہتھیاروں کی ایجاد پر مجبور کرتا رہا ہے۔ ایسا ہی ایک خطرناک ہتھیار ٹینک بھی ہے۔ اپنی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے یہ لوہے کا قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ جس پر کسی چیز کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

۱۳۳۵ء میں اٹلی کے گائیڈو وجیوانو نے اور ۱۴۸۴ء میں اٹلی ہی کے لیونارڈو ڈاونچی نے بھاپ سے چلنے والی ایک جنگی گاڑی کا تصوّر پیش کیا۔ ۱۸۸۵ء میں برطانیہ کے جے کووان نے بھی ایسی ہی ایک گاڑی کا تصوّر پیش کیا جو جنگی مقاصد کے لئے استعمال ہو سکے۔ ۱۸۹۹ء میں برطانیہ میں پہلی مرتبہ چار پہیوں والی گاڑی پر مشین گن نصب کر کے اس جانب ایک قدم اُٹھایا گیا۔ اسی عرصہ میں جنوبی افریقہ میں ہونے والی جنگ کے دوران ایک برطانوی ادارے جان فاؤلر اینڈ کمپنی نے ایک آرمرڈ گاڑی متعارف کروائی۔ آسٹریا میں آسٹرو ڈیملر اینڈ کمپنی نے بھی ۱۹۰۴ء میں ایک جنگی گاڑی تیار کی۔ مگر ان سب تیاریوں کے باوجود سب کے دل میں یہ خواہش موجود تھی کہ کوئی ایسی گاڑی بنائی جائے جو پہیوں کے بجائے پٹری یا ٹریک پر چلتی ہو اور جو ہر قسم کے راستوں اور رکاوٹ کو آسانی سے عبور کر سکے۔ مختلف ممالک ایسی گاڑی بنانے کی دُھن میں لگے رہے۔ اسی دوران پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا اور پورے برِاعظم یورپ اور امریکہ پر جنگ کے بادل چھا گئے۔

ادھر جنگ جاری رہی اور ٹینک بنانے کی ٹیکنالوجی پر برطانیہ اور فرانس میں بھی دن رات کام ہوتا رہا کیونکہ اب ٹینک کی افادیت کھُل کر سامنے آ گئی تھی۔ مگر اس بار بھی برطانیہ، سب پر سبقت لے گیا۔ ستمبر ۱۹۱۵ء میں برطانیہ میں ایک ٹینک تیار کیا گیا۔ جس کا نام "لٹل ولی" رکھا گیا۔ اس کے دوسرے ماڈل کو "بگ ولی" کا نام دیا گیا۔ اس ٹینک کی بناوٹ ایسی تھی کہ یہ چوڑی خندقوں کو بھی عبور کر سکتا تھا۔ چنانچہ بگ ولی کو برطانوی فوج کے لئے منظور کر لیا گیا۔ اور فروری ۱۹۱۶ء میں اس ٹائپ کے سو ٹینکوں کے آرڈر دے دیئے گئے۔

دوسری طرف فرانس میں بھی اس منصوبے پر کام جاری تھا۔ ۱۹۱۶ء میں فرانس نے ایک ٹینک بنایا جس کا نام شنائیڈر رکھا گیا۔ مگر فرانسیسی ٹینک جنگ میں استعمال نہ ہو سکے جبکہ اس وقت تک برطانیہ نے ۴۹ ٹینک تیار کر لئے تھے۔ ٹینکوں کی رفتار صرف چار میل فی گھنٹہ تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی

کہ ٹینک تیز رفتار اور ہلکے ہوں اس طرح ۱۹۱۸ء میں میڈیم اے ٹائپ کا ٹینک سامنے آیا جس کی رفتار آٹھ میل فی گھنٹہ تھی اور ٹینک سے پھینکے جانے والے گولے کی رینج اسّی میل تھی اور وزن چودہ ٹن تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے تک برطانیہ ۲۶۳۶ فرانس ۳۸۷۰ اور جرمنی ۲۰ ٹینک تیار کر چکا تھا۔

۱۹۱۸ کے بعد سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ٹینک رینالٹ ایف ٹی تھا جو فرانس میں بنایا گیا تھا یہ صرف چھ ٹن وزنی تھا۔ جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی بہتر سے بہتر ٹینک بنانے کا کام جاری رہا۔ جرمنی کی شکست میں نمایاں کردار برطانوی ٹینکوں نے بھی ادا کیا تھا۔ اس لئے جرمنی نے اس طرف خاص توجّہ دی۔ اور ۱۹۳۹ء تک اس نے ۳۱۹۵ ٹینک بنا ڈالے۔ اسی وجہ سے دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی دو سالوں میں جرمنی کو قابلِ ذکر کامیابی بھی ہوئی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جرمن ٹینک ایک خاص مشین میں اکٹھے ہو سکتے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں جرمنی نے پینتھر میڈیم ٹینک بنایا جس میں ۷۵ ملی میٹر دہانے کی توپ نصب تھی۔ اس کے علاوہ ایک دلچسپ بات یہ کہ سب سے وزنی ٹینک بنانے کا اعزاز بھی جرمنی کو حاصل ہوا۔ جس کا نام ٹائیگر II تھا۔ اس کا وزن ۶۸ ٹن تھا۔ ۱۹۴۴ء میں روس نے بھی جے ایس ٹینک تیار کر لئے جن کا وزن ۴۶ ٹن تھا اور اس پر ۱۲۲ ملی میٹر دہانے کی توپ نصب تھی۔ ان دونوں ٹینکوں نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران پیدل افواج اور ہلکی فوجی گاڑیوں کو سپورٹ دینے اور طویل فاصلے تک دشمنوں کو نشانہ بنانے کی کارروائی انجام دی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ نے کروسیڈر اور کرامویل نام کے دو ٹینک بنائے۔ مگر یہ جرمن اور روسی ٹینکوں کے مقابلے پر کچھ نہ تھے۔

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد کچھ عرصے کے لئے اس سمت پیش قدمی رُک گئی کیونکہ اس دوران اینٹی ٹینک راکٹ لانچر اور دوسرے ہتھیار بن چکے تھے۔ مگر ۱۹۵۰ کے بعد جب ایٹمی ہتھیاروں کا دور آیا تو صورتحال ایک بار پھر بدل گئی۔

اب ایسے ٹینک بن چکے ہیں جن پر بھاری مشین گن کے ساتھ ساتھ ایسی توپ لگی ہوتی ہے جو

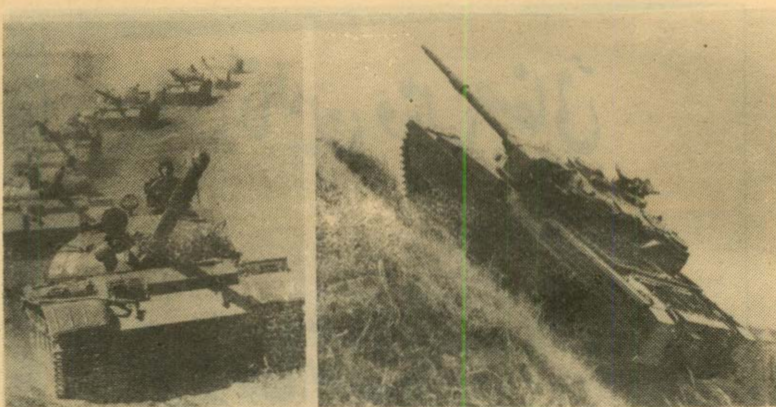

دائیں اور بائیں مُڑ کر بھی فائر کر سکتی ہے۔ اب ایسے ٹینک بھی بنائے جا چکے ہیں جن سے گائیڈڈ میزائل فائر کئے جا سکتے ہیں۔

میدانِ جنگ میں ٹینکوں کے آگے پیدل فوج ہوتی ہے۔ جس کو کور دیتے ہوئے ٹینک اور توپخانہ ہوتا ہے اور اس طرح یہ پیش قدمی جاری رہتی ہے۔ ٹینک کیچڑ، ریت، دلدل، اونچے نیچے راستوں، خندقوں غرض ہر رکاوٹ دور کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اندر موجود عملہ ہر لحاظ سے محفوظ ہوتا ہے کیونکہ وہ صحیح معنوں میں "لوہے کے قلعے" میں ہوتا ہے۔ ٹینک کسی بھی ملک کی برّی فوج کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی ہوئی جس میں بھارت کے چھ سو سے زائد ٹینک شامل تھے اور یوں لگتا تھا جیسے لوہے کی دیوار آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ مگر پاکستانی فوج کے عزم و ہمت نے دشمنوں کی اس دیوار میں شگاف ڈال دیا۔ اس محاذ پر بہادری سے لڑتے ہوئے میجر ضیاالدین عباسی بھی شہید ہوئے جنہیں ستارۂ جرأت کے اعزاز سے نوازا گیا۔

ان سب باتوں کے باوجود اسلحہ کتنا ہی جدید کیوں نہ ہو لڑائی میں صرف سپاہی کا جذبہ ہی اسے فتح و شکست سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن اپنے جدید ترین وسائل کے باوجود پاکستانی فوج کے عزم کو نہ ہلا سکا۔

جہاں قالین وہیں صفائی

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس :

عبداللہ ہارون روڈ فون : ۵۱۱۷۱۱

شاخیں :

○ بہادر آباد	فون : ۴۱۳۶۹۵	○ ڈیفنس فیز V	فون : ۵۲۶۵۳۹
○ جمشید روڈ	〃 ۴۱۱۳۰۲	○ امیر خسرو روڈ	〃 ۴۱۳۶۹۵
○ کھارادر	〃 ۲۲۵۸۰۳	○ راشد منہاس روڈ	〃 ۴۱۱۳۰۲
○ گارڈن روڈ	〃 ۷۲۲۴۳۳	○ حسن اسکوائر	〃 ۵۲۶۵۳۹
○ برنس روڈ	〃 ۲۰۲۳۲۶		

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس : عبداللہ ہارون روڈ۔ کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۳۹

زونل آفس : صدر بازار۔ راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۶۳۲۵۰

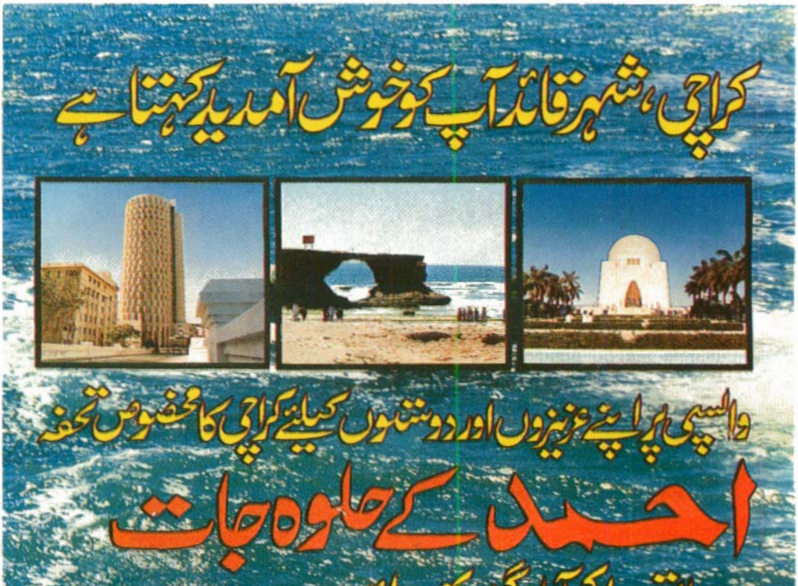
کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
فریش ویل
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
سوہن ڈیلائیٹ
فریش ویل
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA
فریش ویل
MASS

N732RP
HAMMERMILL PAPERS

شین فاروقی

ننّھا شاہین

۲۴ جون ۱۹۸۷ء

صبح کے نو بج چکے ہیں۔ لاس اینجلس کے ایک چھوٹے سے ایئرپورٹ پر ہر طرف مانوس سی ہلکی ہلکی دُھند پھیلی ہوئی ہے۔ ایئرپورٹ کے ایک کونے میں سیسنا۔۲۱۰ ایک چھوٹا سا جہاز کھڑا ہے۔ ایئرپورٹ کے اطراف میں لگی ہوئی ریلنگ کے ساتھ مقامی باشندے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ لوگ بار بار بے چینی سے کبھی اپنی کلائیوں پر بندھی گھڑیوں اور کبھی ایئرپورٹ کے ایک کونے میں بنے ہوئے کیبن کی جانب دیکھتے ہیں اور پھر چپس کھاتے یا چیونگم چباتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ مدھم مدھم گفتگو میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یکایک بھیڑ میں ایک شور بلند ہوا اور سب لوگ تیزی کے ساتھ کھڑے ہو کر کیبن کی جانب دیکھنے لگے جہاں سے سُرخ و سپید رنگت اور بھورے بالوں والا ایک گداز بچہ پائلٹ کا لباس پہنے اپنے انسٹرکٹر کے ساتھ نکل رہا تھا۔ ہجوم نے بچّے کو دیکھ کر زوردار انداز میں تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ بچہ لوگوں کے استقبالیہ نعروں اور تالیوں کا ہاتھ ہلا کر جواب دیتے ہوئے جہاز میں جا کر بیٹھ گیا۔ لوگ خاموش ہو گئے اور تجسّس بھری نظروں کے ساتھ ایئرپورٹ کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے چھوٹے سے جہاز کو دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد وہ چھوٹا سا جہاز گھرگھرا کر رن وے پر دوڑتا ہُوا فضا میں بلند ہو گیا۔ اور یوں دُنیا کی فضائی تاریخ میں ایک نئے ریکارڈ کا اضافہ ہوا۔

جہاز اُڑانے والے اس بچے کا نام جان لیون ہل ہے۔ اس کی عمر گیارہ برس ہے۔ اس اعتبار سے یہ دنیا کا کم عمر ترین پائلٹ ہے۔ کم عمری کے علاوہ جان کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس جہاز کے ذریعہ لاس اینجلس سے واشنگٹن ڈی سی تک ڈھائی ہزار میل کا سفر خود جہاز اُڑا کر طے کیا۔ جان سے پہلے چونکہ اتنے کم عمر بچے نے جہاز اُڑا کر اتنا طویل فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ جس شہر سے گذرا اُس کا زبردست استقبال کیا گیا۔

جان کو جہاز اُڑانے کا شوق اُس وقت ہُوا جب اُس نے اتفاقی طور پر نو برس کی عمر میں ۲۰ منٹ کی پہلی تعارفی فلائٹ لی۔ اس وقت بیس منٹ فضا میں رہنے کے بعد جب وہ دوبارہ زمین پر آیا تو اُس نے اپنے والد سے کہا کہ وہ باقاعدہ جہاز اُڑانا سیکھنا چاہتا ہے۔ جان کے شوق کو دیکھتے ہوئے

اُس کے والد نے اُسے مقامی فلائنگ کلب کا ممبر بنوادیا۔ یوں جان نے نو برس کی عمر سے جہاز اُڑانے کی تربیت حاصل کرنا شروع کردی۔ اپنے شوق کے باعث جان جلد ہی اس منزل پر پہنچ گیا کہ وہ طویل سفر پر روانہ ہوسکے۔

گرچہ جان نے سات دنوں پر مشتمل ڈھائی ہزار میل کا یہ فضائی سفر خود جہاز اُڑاکر طے کیا لیکن اس سفر میں اُس کے ساتھ اُس کا انسٹرکٹر بھی مسلسل موجود رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی سول ایوی ایشن اتھارٹی نے کسی حادثے کے امکان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جان کو تنہا جہاز اُڑانے کی اجازت نہیں دی۔

امریکہ میں تنہا جہاز اُڑانے کے لیے سولہ سال کی عمر ضروری ہے۔

سات دن کے اس طویل سفر کے دوران جان سارا دن جہاز اُڑانے کے بعد شام ڈھلے کسی ایئرپورٹ پر اُتر جاتا اور پھر رات گزار کر صبح پھر اپنے سفر پر روانہ ہوجاتا۔ سفر کے دوران گرچہ کئی بار موسم سخت خراب ہوا لیکن جان کا جہاز ہر بار کسی مصیبت کا شکار ہونے سے محفوظ رہا۔

سفر کے اختتام پر جب جان کا جہاز واشنگٹن کے نیشنل ایئرپورٹ پر اُترا تو وہاں موجود سینکڑوں افراد نے جان کا زبردست استقبال کیا۔

واشنگٹن میں جان نے اپنی پسندیدہ ترین شخصیت امریکہ کے صدر رونالڈ ریگن سے ملاقات کی۔ ملاقات کے بعد صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے جان نے صدر سے اپنی ملاقات کو "شاندار" قرار دیا۔

جان کو صحافیوں سے شکایت ہے کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے، صحافی حضرات سائے کی طرح وہیں پہنچ جاتے ہیں اور بقول جان کے اُس سے اتنے مشکل مشکل سوالات کرتے ہیں کہ وہ پریشان ہوجاتا ہے۔

جان کو مچھلیوں کے شکار کا بہت شوق ہے، مگر اب جہاز اُڑانے کی تربیت میں اُس کا اتنا وقت صرف ہوجاتا ہے کہ اُسے مچھلیوں کے شکار کے لیے وقت نہیں ملتا۔ جان کو اس کا افسوس ہے۔

جان اب جہاز اُڑانے میں اتنا ماہر ہوگیا ہے کہ جہاز اُڑانے کو وہ کار چلانے کی طرح آسان قرار دیتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ جلد جہاز پر پوری دنیا کا سفر کرے۔ جان مستقبل میں خلاباز بن کر چاند پر جانا چاہتا ہے۔ جان کے شوق، محنت اور عزم کو دیکھتے ہوئے آپ کو ہمارا مشورہ ہے کہ جان کے نام کو یاد رکھیں۔ ممکن ہے دس بارہ سال بعد آپ سُنیں کہ جان یبون مِل نام کا ایک خلاباز چاند یا مریخ پر جانے والی شٹل کے چار خلابازوں میں شامل ہے۔

چاند، پیڑ، ہوا

چاند

شاید خود کو سمجھ رہا ہو
آسمان کا ہیرو چاند
لیکن مجھ کو تو لگتا ہے
ایک بڑا سا زیرو چاند

پیڑ

کھڑے کھڑے کیوں پھانک رہے ہو
بھیا پیڑ سڑک پر دھول
کمرے میں آ جاؤ ورنہ
ہو جائیں گے میلے پھول

ہوا

بند کر دیا دروازہ تو
کھڑکی سے آ گئی ہوا
پانی مانگا، ٹائم پوچھا
پتا لکھا تب گئی ہوا

شاہ نواز فاروقی

آنکھ مچولی سالنامہ؟

جی ہاں! ــــــــ آئندہ مہینے آنکھ مچولی پورے دو سال کا ہوجائے گا۔ اپنی دوسری سالگرہ کی خوشی میں آنکھ مچولی اپنے ساتھیوں کو

سالنامہ ۸۸ء

کا تحفہ دے رہا ہے

اس یادگار اور ضخیم سالنامے میں

- آپ کے پسندیدہ پُرانے اور نئے قلمکاروں کی دلچسپ اور رنگارنگ تحریریں
- چٹ پٹی نظمیں اور رنگین تصویریں
- معلوماتی اور سائنسی مضامین
- اس کے علاوہ سارے مستقل سلسلے
- آپ کی فرمائش پر نئے اور انعامی سلسلے
- اور بے شمار دلچسپیاں، بہت سے رنگ اور لاتعداد شوخیاں!

سالنامے کے ساتھ ایک نہایت حسین تحفہ مُفت

آج ہی اپنا شمارہ محفوظ کروا لیجئے!

ہمارے ۳۲ محافظ

ابنِ شہباز خان

"مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے"

یہ بات البیرونی نے کہی تھی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ کسی کی خلوص بھری مسکراہٹ سے انسان کی روح تک خوش ہو جاتی ہے، مگر اس میں تھوڑی سی یہ ترمیم کرنی پڑے گی کہ خوشی اُس انسان کی مُسکراہٹ سے حاصل ہوتی ہے جس کے دانت صاف اور چمکدار ہوں، دانت میلے اور پیلے ہوں تو آپ کی یہی خواہش ہوگی کہ یہ شخص کبھی نہ مُسکرائے۔ یہ حقیقت ہے کہ دیگر چیزوں کے علاوہ دانت بھی ہماری شخصیت کا نہایت اہم حصّہ ہیں اور ان کا ہماری صحت سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق زیادہ تر بیماریاں ہمیں منہ سے، یعنی دانتوں کے ذریعے لگتی ہیں۔ یقیناً آپ سوچ رہے ہوں گے، وہ کس طرح؟ وہ اس طرح کہ کوئی بھی چیز جو ہم کھاتے ہیں، پہلے وہ منہ میں جاتی ہے، پھر دانت

اُسے چباتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ قیمے کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر ہمارے معدے میں جا پہنچتی ہے۔ اب اگر ہمارے دانت صحت مند اور توانا نہ ہوں۔ یا میلے اور جراثیم آلود ہوں تو یقیناً وہ غذا کو بھی جراثیم آلودہ کر دیں گے اور یوں ہم مختلف بیماریوں کا شکار ہوتے چلے جائیں گے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے منہ میں موجود دانت ہمارے محافظ ہیں۔ جب تک یہ صحت مند اور تندرست و توانا ہیں۔ ہم بہت سی بیماریوں سے بیگانہ ہیں۔ یعنی دانت اچھے تو صحت اچھی۔!

دوسری چیزوں کا ہم کتنا خیال رکھتے ہیں۔ لباس صاف ستھرا اور استری کیا ہوا پہنتے ہیں۔ جوتے پالش ہوتے ہیں۔ بالوں کو نئے سے نئے اور خوبصورت انداز میں سنوارتے ہیں۔ چہرے کو صابن سے دھوتے ہیں اور حسبِ توفیق اس کی آرائش بھی کرتے ہیں، مگر دانتوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے۔ کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں کہ ایک شخص محفل میں آیا، بے حد خوش لباس اور خوبصورت، اس کے لباس سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی ہیں۔ مگر جب اُس نے گفتگو کی تو لوگوں کو اُس کی خوش لباسی اور خوبصورتی کے باوجود گھِن کا احساس ہوا۔ کیونکہ اس کے دانت میلے تھے اور اس کے منہ سے بُو آ رہی تھی۔

ہوتا دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ کھاتے تو رہتے ہیں، بلکہ ہمارا دن اور رات کا بیشتر حصّہ کھانے پینے میں ہی گزرتا ہے، مگر ہم دانتوں کی صفائی کا خیال بالکل نہیں رکھتے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ آپ کے پاس کوئی مشینری ہے اور آپ اُسے مسلسل استعمال کریں، مگر اس کی صفائی سے لاپروائی برتیں اور اس کی دیکھ بھال نہ کریں تو یقیناً وہ ایک دن جواب دے جائے گی۔ اور آپ سوچتے ہی رہ جائیں گے کہ یہ کیا ہُوا؟ لہٰذا اس سے قبل کہ آپ کے دانت کمزور ہو کر اپنی جگہ چھوڑ دیں اور آپ پر وقت سے پہلے بڑھاپا آجائے، کیوں نہ آپ دانتوں کی صفائی کو روزانہ کا معمول بنالیں۔

یوں تو کوئی بھی چیز کھانے کے بعد کسی اچھے ٹوتھ پیسٹ یا منجن سے دانت ضرور صاف کر لینے چاہئیں چونکہ جدید مصروف مشینی زندگی میں ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہر کھانے کے بعد ہم برش کریں یا منجن سے دانتوں کو صاف کریں۔ اس لیے اتنا ضرور کرنا چاہیئے کہ کوئی چیز کھانے کے بعد اچھی طرح کلی کر لیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ دانتوں کی ریخوں میں غذا کے جو ذرات پھنسے ہوتے ہیں، وہ نکل جاتے ہیں۔ اور دانت کیڑوں اور مختلف بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں اور منہ سے بُو بھی نہیں آتی۔

مسوڑھوں اور دانتوں کو قدرت نے ایک ریشہ دار جھلی میں لپیٹ رکھا ہے۔ تازہ خون، تازہ آکسیجن کے ساتھ اس جھلی میں پہنچتا رہتا ہے اور دانت مضبوط رہتے ہیں۔ لیکن جب غذا کے ذرات دانتوں

کی جڑوں میں پہنچ کر گلنے سڑنے شروع ہو جاتے ہیں تو اوکسیجن کی مناسب فراہمی جھلّی کو ملنا بند ہو جاتی ہے۔ یوں دانت گلنے سڑنے اور کمزور ہونے لگتے ہیں۔ اُن سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے اور پیپ پڑ جاتی ہے۔ یوں ہم اپنے ہی ہاتھوں قدرت کی ایک نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس لیے دانتوں کی حفاظت اور صفائی بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ فعل ہضم دانتوں ہی سے اس وقت شروع ہو جاتا ہے، جب ہم لقمہ چباتے ہیں۔

دانت کب نکلتے ہیں؟

پیدائش سے چھ ماہ کے اندر بچے کے دانت نکلنے شروع ہو جاتے ہیں اور اس دوران میں وہ اکثر بیمار ہو جاتے ہیں۔ اڑھائی سال کے عرصے میں بتیس دانت نکل آتے ہیں، مگر یہ دودھ کے دانت ہوتے ہیں اور چھ سال کی عمر میں جھڑنے لگتے ہیں۔ ان کے بعد پکّے اور مستقل دانت نکل آتے ہیں، جو تعداد میں بتّیس ہوتے ہیں۔ ان میں سے آخری چار داڑھیں بیس اکیس سال کی عمر میں نکلتی ہیں۔ ان کو عقل داڑھیں کہا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت ان داڑھوں کا عقل سے کوئی تعلق نہیں۔!

دانتوں کی حفاظت کے لیے مختلف تدابیر

● سال میں کم ازکم تین مرتبہ دانتوں کے کسی ماہر سے منہ اور دانتوں کا معائنہ کروانا چاہیئے۔ تاکہ اگر کوئی سوراخ ہو تو اُسے بھروالیا جائے اور اگر کوئی مرض ہو تو اس کا بر وقت علاج کروالیا جائے۔ اگر کوئی تکلیف نہ بھی ہو تو ڈینٹسٹ سے دانتوں کی صفائی اور سکیلنگ رمسوڑھوں کے نیچے دانت پر جمے ہوئے میل کو کھُرچنا) کروالینی چاہیئے۔

● بیماری کی حالت میں دانتوں کی صفائی کا خاص خیال رکھنا چاہیئے، کیونکہ بیماری کی وجہ سے منہ میں تیزابی مادّے زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

● گرم چیز کھانے کے بعد سرد اور سرد چیز کے بعد فوراً گرم چیز نہیں کھانی چاہیے۔ ان کے درمیان کم ازکم بیس منٹ کا وقفہ ضروری ہے۔

● کھانا ختم کرنے کے بعد سب سے پہلے خلال کرنا چاہیے۔ عام طور پر اس مقصد کے لیے ٹوتھ پک استعمال کی جاتی ہے، لیکن ٹوتھ پک میں یہ خرابی ہے کہ اس سے دانتوں کے درمیان والی درزوں سے

خوراک کے ذرات تو نکل جاتے ہیں، لیکن ان کے جُڑے ہوئے حصّوں سے گوشت اور دوسری چیزوں کے ریشے نہیں نکل پاتے۔ اس مقصد کے لیے کیمسٹ سے کسی اچھی کمپنی کا تیار کردہ ڈینٹل کورڈ خریدا جاسکتا ہے، لیکن یہ قدرے مہنگا ہوتا ہے۔ اس لیے کسی مضبوط دھاگے سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے۔

● بہت گرم اور یخ اشیا دانتوں کے لیے سخت مضر ہوتی ہیں۔ جیسے بہت سے لوگ آئس کریم کو بھی دانتوں سے چبا کر کھاتے ہیں۔ یہ حرکت دانتوں پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ آئس کریم تالو اور زبان کی مدد سے کھانی چاہیے۔

● عام طور پر نمکین اشیاء کھانے کے بعد میٹھا کھانے کا رواج ہے۔ یہ طریقہ درست نہیں۔ دانتوں کی صحت کے لیے کھانے کا اختتام کسی نمکین چیز سے کرنا چاہیئے۔ اگر آپ کو اپنے دانت عزیز ہیں تو میٹھی چیزوں سے حتی الامکان پرہیز کیجیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو میٹھا کھانے کے بعد فوراً کلی کر لیجیے۔ چائے، کافی، شربت اور سافٹ ڈرنکس پینے کے بعد بھی دو تین کلیاں کر لینی چاہئیں۔

● کبھی کبھار دانتوں کو ورزش بھی کرانی چاہیئے۔ اس کا آسان اور سیدھا سا طریقہ یہ ہے کہ گنڈیریاں چوسی جائیں۔ مکئی کے بھنے ہوئے دانے چبائے جائیں اور گاجریں کھائی جائیں۔ اس سے دانتوں کے ساتھ مسوڑھوں کی بھی ورزش ہو جاتی ہے۔ دیہاتی لوگ یہ اشیا اکثر استعمال کرتے ہیں، اسی لیے ان کے دانت شہریوں کی نسبت بہت مضبوط ہوتے ہیں۔

دانتوں کی صفائی کا صحیح طریقہ

مسواک یا برش کے استعمال کے بغیر دانتوں کی صحت اور خوبصورتی قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ دانتوں کی صفائی غیر ضروری سمجھی جاتی تھی، لیکن آج کل جبکہ ہم مختلف قسم کی غذائیں کھاتے ہیں۔ اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا صفائی کی اس مد پر جتنا بھی وقت خرچ کیا جائے، کم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دانتوں کو کیسے صاف کیا جائے؟ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر لوگ برش کو دانتوں پر اُلٹا سیدھا، دائیں بائیں، اُوپر نیچے یوں رگڑتے ہیں، جیسے کسی زنگ آلود لوہے سے زنگ صاف کر رہے ہوں۔ اس سفاکانہ صفائی سے مسوڑھوں کو نقصان پہنچتا ہے اور ان کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کی وجہ سے دانت کمزور اور حساس ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے دانتوں کو سرد یا گرم چیز کے لگنے کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ دانتوں کی صفائی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ برش کی حرکت مسوڑھے

سے دانت کی طرف ہو۔ دانت سے مسوڑھے کی سمت برش نہیں لے جانا چاہیئے۔ اسی طرح دانتوں کی اندرونی اور اُوپری سطح (جہاں وہ آپس میں ملتے ہیں) کو بھی برش سے اچھی طرح صاف کرنا چاہیئے۔ تاکہ سارے دانت ہر جانب سے صاف ہو کر چمکنے لگیں۔ بعدازاں کسی اچھے قسم کے محلول سے کلّی کرنی چاہیئے۔ ہائی ڈروجن پیرا کسائڈ Hydrogen per Oxide کے دس قطرے برش پر چھڑک کر دانتوں پر مَل لیے جائیں تو دانت سفید اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔ دانتوں کی جڑیں کمزور ہو جائیں تو کسی اچھے ڈینٹسٹ سے مشورہ کرنا چاہیے۔ جن لوگوں کے دانت مضبوط ہوں، انھیں نیم یا کیکر کی تازہ مسواک استعمال کرنی چاہیے۔

اب آتی ہے بُرش کی باری۔ یاد رکھیے ٹوتھ پیسٹ خشک برش پر لگانا چاہیے۔ اُسے پانی سے گیلا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دانت صاف کرنے کے بعد پانی کی دھار ڈال کر اُسے اچھی طرح جھٹک دینا چاہیئے۔ تاکہ اس میں سے پانی نکل جائے اور وہ اگلی مرتبہ استعمال کے لیے خشک ہو جائے۔ برش کو دھونے کے لیے انگوٹھے سے ہرگز نہیں رگڑنا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے برش کے ریشے بکھر جاتے ہیں۔ جو مسوڑھوں کو زخمی کر سکتے ہیں۔ پُرانے برش میں بھی یہی خرابی پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے دوسرے تیسرے مہینے برش کو تبدیل کر لینا چاہیئے۔ بہت سخت ریشوں والا برش استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے دانتوں کے اینمل کو نقصان پہنچتا ہے۔ چھوٹے اور قدرے نرم ریشوں کا برش اچھا ہوتا ہے۔ دانتوں کے ساتھ مسوڑھوں کی صفائی بھی نہایت ضروری ہے۔ کم از کم دن میں ایک بار اُنگلی پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر مسوڑھوں پر مالش کر لینے سے مسوڑھے صحت مند رہتے ہیں۔ رات کو بستر پر جانے سے پہلے کسی جراثیم کش محلول سے کلیاں کر لی جائیں تو یہ سونے پہ سہاگہ والی بات ہوگی۔

سب سے آخری اور اہم بات یہ ہے کہ دانتوں کی صفائی کس وقت کرنی چاہیئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کوئی بھی چیز کھانے کے بعد دانت صاف کرنے چاہئیں، مگر یہ خاصا مشکل ہے۔ اس لیے دانتوں کی صفائی کا بہترین وقت رات کو سونے سے پہلے اور صبح ناشتے کے بعد کا ہے۔ بہت سے لوگ کاہلی سے کام لیتے ہوئے رات کو دانت صاف کیے بغیر سو جاتے ہیں۔ یہ انتہائی خطرناک بات ہے۔ ایسا شخص اپنے دانتوں سے دشمنی کرتا ہے۔ رات کے وقت منہ بند رہتا ہے اور دانتوں میں موجود خوراک کے ذرّات گل سڑ کر تعفن پیدا کرتے ہیں اور مسوڑھوں اور دانتوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ صبح اُٹھ کر برش کرتے ہیں، وہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ ناشتہ ہم اس کے بعد کرتے ہیں اور ناشتہ کرنے کے بعد ہی برش کرنا چاہیے۔

امّی۔ امّی آپ کی کھوئی ہوئی سوئی مِل گئی!

دوسرا حصّہ

طاہر مسعود

ٹارزن کراچی میں

ٹارزن کی آنکھ سمندر کے کنارے کُھلی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا۔ ساحل پر کھڑے لوگ اُسے حیرت سے دیکھتے رہے۔ ٹارزن نے اُن سے اپنا تعارف کرایا۔ کچھ دیر میں وہ آپس میں بے تکلف ہو گئے۔ اُن لوگوں نے ٹارزن کو کھانے کی پیشکش کی تو وہ اُن کا سارا کھانا کھا گیا۔ پھر وہ باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران میں ایک انسپکٹر ٹارزن کے پاس آکر بولا "آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔"

اب بعد کے واقعات پڑھیے

"انسپکٹر"، ٹارزن نے کہا "میں ٹارزن ہوں کسی کا پالتو طوطا نہیں ہوں۔ مجھے گرفتار کرنا آسان بات نہیں کیا سمجھے "

"مجھے معلوم ہے۔ آپ مجھے ٹارزن اور طوطے کا فرق سمجھانے کی کوشش نہ کریں"، انسپکٹر کا لہجہ بے حد رُوکھا تھا۔

"لیکن آپ ٹارزن کو کیوں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا جرم کیا ہے؟" نیلی آنکھوں والی لڑکی غصّے سے بولی۔

"پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر ملک میں داخل ہونا، یہی ان کا جُرم ہے" انسپکٹر نے کہا۔

"انسپکٹر ہوش کے ناخن لیں۔ آپ جنگل کے بادشاہ سے ویزا اور پاسپورٹ مانگ رہے ہیں آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ ٹارزن صاحب نے ہمارے شہر کو عزت بخشی اور یہاں تشریف لائے۔ ورنہ دنیا کے کسی شہر میں بھی آپ کو لوگ ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے منتظر ہیں۔" سفید بالوں والے پروفیسر نے ٹارزن کا دفاع کیا۔

"دیکھیئے جناب" انسپکٹر نے کہنا شروع کیا "مَیں ٹارزن کی عظمت اور مقبولیت سے خوب اچھی طرح واقف ہوں۔ ان کی بہادری کے واقعات اور کارنامے مَیں نے بچپن ہی میں پڑھ رکھے ہیں۔ بلکہ اس قسم کی کہانیاں پڑھنے کی وجہ سے میں اپنے والد صاحب کے ہاتھوں سے کئی بار پٹا بھی ہوں۔ لیکن میں کیا کروں؟ قانون بہرحال قانون ہے۔ اور مجھے اُمید ہے آپ لوگ قانون سے تعاون کریں گے۔" انسپکٹر بولتے بولتے رُکا، سب چُپ تھے۔ لوہا گرم دیکھ کر انسپکٹر نے ایک اور چوٹ کی۔ اس نے کہا: "مسٹر ٹارزن یقیناً جنگل کے بادشاہ ہیں، لیکن شہر میں بادشاہ نہیں چلتے، قانون چلتا ہے اور قانون کی نظر میں سب برابر ہوتے ہیں۔"

ٹارزن نے جو خاموشی سے سُن رہا تھا، ہاتھ اٹھا کر کہا: "جنگل میں میرے ایک دوست تھے۔ مسٹر ولیم انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ شہروں میں قانون سے زیادہ سفارش چلتی ہے، رشوت چلتی ہے، اثر ورسوخ چلتا ہے انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ایشیا میں قانون صرف کاغذ پر ہوتا ہے۔"

"بہت خوب!" انسپکٹر نے کہا: "پھر تو مسٹر ولیم نے آپ کو یہ بھی بتایا ہو گا کہ ایشیا میں پولیس کتنی طاقتور ہوتی ہے۔ اور اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہوتے ہیں۔"

اس گفتگو میں جینز والے نوجوان نے دفعتاً مداخلت کی اس نے ٹارزن کے نزدیک آ کر اس کا شانہ تھپتھپایا

"یہ بحث فضول ہے۔ اگر آپ کو گرفتاری سے بچنا ہے تو ایک ہی صورت ہے۔"

"وہ کیا؟" ٹارزن نے پوچھا۔

"کیا آپ کی آئی جی یا ڈی آئی جی سے کوئی جان پہچان ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی سلام دُعا۔"

"آپ گھاس کھا گئے ہیں کیا؟" ٹارزن نے جھنجھلا کر کہا "یہاں آئے ہوئے ابھی مجھے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔"

"آپ ٹارزن کو خراب کرنے کی کوشش نہ کریں۔" انسپکٹر نے نوجوان کو گھورتے ہوئے کہا: "آپ انہیں بھی

وہی ہتھکنڈے سکھا رہے ہیں جو آپ جیسے شہری چھوٹے افسران پر آزماتے رہتے ہیں۔"

"اور آپ بھی ٹارزن کو اتنا بیوقوف نہ سمجھیں۔ انھیں خوب پتہ ہے کہ شہروں میں کیا ہوتا ہے۔" نیلی آنکھوں والی لڑکی بولی۔

"میرا خیال ہے" انسپکٹر نے سرد لہجے میں کہا: "ہم غیر ضروری گفتگو میں بہت سارا وقت ضائع کر چکے ہیں۔ مسٹر ٹارزن! اب آپ کو میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔"

"لیکن کہاں؟" ٹارزن نے پوچھا

"پولیس اسٹیشن" انسپکٹر نے مختصر سا جواب دیا۔

"مسٹر ولیم نے مجھ سے ایک بار ٹی وی اسٹیشن کا ذکر کیا تھا۔ کیا پولیس اسٹیشن بھی ایسی ہی کوئی جگہ ہے؟" ٹارزن نے سوال کیا۔

"پولیس اسٹیشن اور ٹی وی اسٹیشن میں بہت فرق ہے ٹارزن۔ کوئی شریف آدمی پولیس اسٹیشن جانا پسند نہیں کرتا لیکن ٹی وی اسٹیشن جانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔"

"شریف آدمی؟" ٹارزن ہنسا "یہ کیا ہوتا ہے؟"

"جیسے ہم لوگ ہیں" ایک موٹے سے لڑکے نے کہا۔ "ہم میں سے کوئی بھی پولیس اسٹیشن جانا پسند نہیں کرتا۔"

"میں بتاتا ہوں ——" انسپکٹر آگے بڑھا "شریف آدمی کا مطلب ہے ڈرپوک آدمی، بزدل آدمی۔"

"لیکن میں ڈرپوک نہیں ہوں" ٹارزن نے چھاتی پھلاتے ہوئے کہا۔ "اگر یہی بات ہے تو میں ابھی پولیس اسٹیشن جانے کے لیے تیار ہوں۔"

انسپکٹر نے یہ سُن کر ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اُس نے پھُرتی سے اپنی جیب سے ہتھکڑیاں نکالیں اور ٹارزن کے ہاتھوں میں پہنا دیں۔ اب وہ فاتحانہ نظروں سے ہجوم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ٹارزن انسپکٹر کے ہمراہ جیپ کی طرف چل پڑا۔ دیوقامت ٹارزن کے ساتھ چلتے ہوئے انسپکٹر اور پولیس کے سپاہی نہایت بونے اور کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ ٹارزن نے جیپ کی اگلی نشست پہ بیٹھنے کے بعد الوداعی ہاتھ ہلایا اور جواب میں سب نے افسردگی سے اپنے اپنے ہاتھ لہرائے۔

"خدا حافظ ٹارزن" انہوں نے چیخ کر "خدا حافظ" اس طرح کہا جیسے کہہ رہے ہوں کہ "ٹارزن! تم تو واقعی جنگل کے بادشاہ نکلے۔"

جیپ گھر گھرائی اور پھر اونچے نیچے راستوں پر روانہ ہو گئی۔ رستے میں ٹارزن بلند و بالا عمارتوں اور ٹریفک کے بے تحاشہ ہجوم کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ کئی بار تو اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ خاص طور پر اس وقت جب اس نے دیکھا کہ کس طرح ایک نوجوان تیز رفتاری کا مقابلہ کرتی ہوئی دو بسوں کے درمیان سے اپنی موٹر سائیکل کو زگ زیگ انداز میں اڑائے لیے جا رہا ہے۔ اور ایک بس کی چھت اور پائیدان اور کھڑکیوں سے لوگوں کو لٹکتے دیکھ کر ٹارزن کا منہ حیرت اور تشویش سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک بائیسکل سوار نے تیز رفتار ٹرک کی زنجیر پکڑ رکھی ہے اور اس کی بائیسکل بھی ٹرک ہی کی رفتار سے بھاگتی جا رہی ہے۔ جیپ چوراہے کو عبور کر کے آگے بڑھی تو دو تین بچے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دوسری طرف جانے کے لیے سڑک کے بیچوں بیچ آکر کھڑے ہو گئے۔ اب ان کے چاروں طرف سے گاڑیاں دیوانہ وار گزر رہی تھیں لیکن وہ نہایت اعتماد سے خوش گپیوں میں مصروف راستہ صاف ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹارزن ہر ہر منظر کو پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ کئی بار تو خوف کی سرد لہر اس کی ہڈیوں میں اترتی چلی گئی۔ اسے اپنے کسرتی جسم پر، اپنی بہادری اور بے مثال کارناموں پر ناز تھا لیکن اب وہ جن لوگوں کے درمیان تھا وہ دیکھنے میں تو کمزور تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ موت سے آنکھ مچولی کھیلنا ان کی سرشت میں شامل ہے۔

جیپ پولیس اسٹیشن کی پیلی رنگت کی بوسیدہ سی عمارت کے اندر رُکی اور جب اس میں سے گرانڈیل ٹارزن اُترا تو گیٹ پر پہرہ دیتے ہوئے سپاہی کی ٹانگیں ایک لمحے کے لیے کپکپانے لگیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے عمارت کی فضا میں ہلچل سی مچ گئی۔ اندر لاک اپ میں قیدی بھی ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر اس عظیم اور ناقابل تسخیر انسان کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے جس کی کہانیاں زبان زدِ عام تھیں۔

پولیس انسپکٹر نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ٹارزن کو کرسی پیش کی اور سگریٹ سلگا کر نیم دراز ہو گیا۔

پھر یکایک اُسے کچھ خیال آیا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ ٹارزن کی طرف بڑھایا۔

"سگریٹ سے شوق فرمائیے۔"

"شکریہ! مجھے ناک سے دھواں بکھیرنے کا کوئی شوق نہیں۔"

"اچھا اب آپ کی صحت کا راز معلوم ہوا" انسپکٹر نے خوش دلی سے کہا۔

"سگریٹ کے متعلق مسٹر ولیم نے مجھے بتایا تھا کہ" ٹارزن نے کہا: "اس کے ایک سرے پر آگ ہوتی ہے اور دوسرے سرے پر ایک احمق !"

"بہت خوب!" انسپکٹر ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوتے اس کی توند خوب زور زور سے ہلنے لگی۔ ٹارزن اس کی ہلتی ہوئی توند کو غور سے دیکھنے لگا اس کا جی چاہا کہ وہ انسپکٹر سے اس کی موٹی توند کے بارے میں کچھ پوچھے۔ لیکن پھر وہ چپ رہا۔ انسپکٹر نے اردلی کو آواز دے کر اسے ٹھنڈی بوتلیں لانے کی ہدایت کی اور پھر ٹارزن سے کہا: "اگر آپ تیار ہوں تو قانونی کارروائی مکمل کر لی جائے۔"

ٹارزن نے بجائے جواب دینے کے اپنی عقابی نگاہوں سے انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھا۔ انسپکٹر نے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں۔ دفعتاً پولیس اسٹیشن کا احاطہ گاڑیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ دس افراد کمرے کے اندر گھس آئے۔

"کون ہیں آپ؟ اس طرح بلا اجازت کمرے کے اندر آنے کی آپ لوگوں کو جرأت کیسے ہوئی؟" انسپکٹر دھاڑا۔

"آرام سے انسپکٹر" آنے والوں میں ایک ادھیڑ عمر مگر باوقار شخص نے ہاتھ اٹھا کر کہا: "ہم اخبارات کے نمائندے ہیں۔ پریس رپورٹرز۔ ہم مسٹر ٹارزن سے ملنے آئے ہیں۔ امید ہے آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" یہ سنتے ہی انسپکٹر کے چہرے کی بوکھلاہٹ دیکھنے والی تھی۔ اس نے گھبرا کر ٹارزن کی طرف دیکھا ـــــ اور تب ٹارزن کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

(ٹارزن پر کیا بیتی ـــــ آئندہ شمارے میں پڑھیئے)

انگریزی خون

افریقہ کے ایک ایسے علاقے میں، جہاں کبھی آدم خور رہتے تھے انگریزوں نے تسلط کے بعد اس کی ترقی کی سرگرم کوششیں کیں اور آخر انہیں کسی حد تک انسان بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ لوگ مہذب شہریوں کی طرح رہنے لگے اور آدم خوری ترک کردی۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کا عہد تھا۔ ملکہ نے اس علاقے کا دورہ کرنا چاہا لیکن طے یہ پایا کہ اس نیم متمدن علاقے کی ملکہ کو لندن میں ملکہ وکٹوریہ سے ملوایا جائے۔ چنانچہ وحشیوں کی ملکہ قصر بکنگھم پہنچا دی گئی اس نے ملکہ وکٹوریہ سے نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور فخریہ کہا "مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میری رگوں میں بھی انگریزی خون دوڑ رہا ہے۔!"

ملکہ وکٹوریہ نے تعجب سے پوچھا "وہ کس طرح؟"

وحشیوں کی ملکہ نے جواب دیا "عرصہ گزرا ہمارے آباؤاجداد نے ایک انگریز کو کھایا تھا۔"

محمد ساجد، ہوتی (مردان)

آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کے تحائف

راہنما کتابیں

اِن کا مطالعہ علم بڑھائے گا
اِن کی موجودگی مفید ثابت ہوگی

قرآنی حکایات کا

۱۰۴ صفحات

پر مشتمل خوبصورت مجموعہ

اس کے حصول کے لئے ۱۰ روپے کا منی آرڈر ارسال کیجئے

خاکِ وطن سے سرزمینِ حرم تک

معلومات بھی — راھنمائی بھی

حجاج اور زائرین کے لئے نادر تحفہ — ۲۰۳ صفحات

اس کتاب کے لئے ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کیجئے

اسلام کی بنیادی معلومات

۴ حصے

جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف:- مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

تعلیم الاسلام مفت حاصل کرنے کے لئے فی کتاب ۲/ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کیجئے

پتہ:- گرین گائیڈ بک سیریز - گرین گائیڈ اکیڈمی
ڈی ۔ ۱۱۲ ۔ نورس روڈ سائٹ، کراچی ۔ ۱۶

کلیم چغتائی

افضلا

"کچھ سُنا آپ نے۔؟"

جمیل صاحب نے اس آواز پر مُڑ کر دیکھا۔ شیخ صاحب اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی نچاتے ہوئے اپنی کراری آواز میں کہہ رہے تھے "محلّے سے گٹر کے ڈھکن پھر غائب ہوگئے!" ان کا چہرہ غُصّے کے مارے سُرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنے ایک ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو بار بار اپنے دوسرے ہاتھ پر بجا رہے تھے۔

"جی ہاں مجھے معلوم ہے۔" جمیل صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"یہ سب ... یہ سب اس اوّل نمبر کے غُنڈے افضلے کا کیا دھرا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں، اس کے اشارے پر محلّے میں چوریاں ہوتی ہیں، دکانداروں سے بھتّہ لیا جاتا ہے اور اب یہ گٹر کے ڈھکن تیسری مرتبہ غائب ہوگئے ہیں۔" شیخ صاحب سانس لینے کو رُکے اور پھر شروع ہوگئے "ارے میں کہتا ہوں، ہم بچّوں والے لوگ ہیں، بچّے گلیوں میں کھیلتے ہیں، اللہ نہ کرے کوئی بے دھیانی میں کسی کُھلے ہوئے مین ہول میں جا پڑے، اس کا ہاتھ پیر ٹوٹ جائے تو کیا افضلا اس کا علاج کرائے گا، ارے بچّے تو بچّے، بڑے بھی بعض اوقات چلتے ہوئے خیال نہیں کرتے۔ ڈپٹی صاحب کا لڑکا پندرہ دن سے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ بیچارے نے سرکاری محکموں کے کتنے چکّر کاٹے جب کہیں جا کر بلدیہ والے یہ گٹر کے ڈھکن لگا گئے۔ ابھی کل ہی تو لگے تھے یہ ڈھکن، اور راتوں رات

غائب۔ اور پتا ہے؟ بلدیہ والے کہہ گئے تھے کہ اگر اب یہ ڈھکن غائب ہوئے تو پھر نہیں لگنے کے ڈھکن۔ حد ہو گئی۔"

شیخ صاحب پھر سانس لینے کو رُکے تو جمیل صاحب نے موقع پر کہا" پھر میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں شیخ صاحب؟"

"اجی کرنا کیا ہے، میں تو کہتا ہوں، سب محلّے والے مل کر پولیس میں رپٹ لکھوا دو مگر کوئی آگے آتا ہی نہیں۔"

"لیکن کیا پولیس جانتی نہیں کہ یہاں افضلے اور اس کے ساتھی کیا کر رہے ہیں؟"

"جانتی کیوں نہیں۔۔۔ اچھا یوں کرو، مقدمہ کر دو اس بدمعاش پر، عدالت خود ہی نمٹ لے گی۔"

"ارے نہیں شیخ صاحب، آپ کس چکّر میں پڑ رہے ہیں۔"

"بس تو پھر بھگتو۔۔۔ کل کلاں کو آپ کا بچّہ اللہ نہ کرے کسی کھلے ہوئے مین ہول میں گر گیا تو کرتے رہئے گا ماتم۔۔۔ ہمارا کیا۔ یہاں تو کوئی بھلی بات سُننے کو تیار ہی نہیں۔۔۔ شیخ صاحب بڑبڑاتے ہوئے آگے چل دیے۔

افضلے کا اصل نام شاید افضل دین یا افضل محمّد تھا جو اب بگڑ کر افضلے بن گیا تھا۔ اس کی یوں تو بازار میں دُودھ دہی کی اچھی خاصی بڑی دکان تھی، لیکن معلوم نہیں اس کو بدمعاشی کرنے میں کیا لطف آتا تھا یا اسے دولت کی کتنی حرص تھی کہ اس نے دس بارہ غُنڈے پال رکھے تھے جو اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔ افضلے کی دھاک اس محلّے ہی میں نہیں بلکہ دُور دراز کے علاقوں تک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ محلّے والے اس سے بُری طرح پریشان تھے، لیکن افضلے کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ افضلا جو مضبوط جسم والا، اونچے قد کا پہلوان نُما شخص تھا اور جو اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اکثر اِدھر اُدھر گھُومتا نظر آتا تھا۔ اِس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں جنھیں وہ بار بار تاؤ دیتا رہتا تھا۔

اُس رات لوگ گھروں میں بیٹھے ٹیلی وژن پر ڈراما دیکھ رہے تھے کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ لوگ اندھیرے اور گرمی سے گھبرا کر چھتوں پر یا گلیوں میں آ نکلے۔ شیخ صاحب بھی اپنے گھر کے باہر کُرسی ڈالے بیٹھے اپنے داماد اور بہنوئی سے باتیں کر رہے تھے۔ چاروں طرف بلیک آؤٹ کا سا سماں تھا۔ وہ چاندنی رات بھی نہ تھی۔ شیخ صاحب کا مکان سڑک پر ہی تھا، کبھی کبھار کوئی گاڑی گزرتی تو اس کی بتّیوں سے چند لمحوں کے لیے، سڑک پر روشنی کے لہریئے سے بن جاتے۔

اچانک ایک طرف سے ایک موٹر سائیکل نمودار ہوئی، موٹر سائیکل چلانے والا شاید بڑی جلدی میں تھا، جب ہی تو وہ موٹر سائیکل کو طوفانی رفتار سے دوڑا رہا تھا۔ اس وقت شیخ صاحب اور اُن کے ساتھ بیٹھے لوگ اپنی جگہ سے اُچھل پڑے کیوں کہ ان کے سامنے ابھی ابھی تیزی سے گزرنے والی موٹر سائیکل کسی چیز سے ٹکرا کر ہَوا میں اُچھلی تھی اور دھماکے کے ساتھ زمین پر گر کر دُور تک گھِسٹتی چلی گئی تھی۔

شیخ صاحب اپنے داماد اور بہنوئی کے ساتھ موٹر سائیکل کی طرف بھاگے۔ گری ہوئی موٹر سائیکل کا انجن تھرتھرا کر خاموش ہو چکا تھا۔ اندھیرے میں انھیں موٹر سائیکل کی جگہ ایک ڈھیر سا نظر آ رہا تھا۔ کسی نے ماچس جلائی۔ اس کی

ہلکی سی روشنی میں موٹر سائیکل سوار ایک طرف پڑا ہوا نظر آیا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور ایک ٹانگ بھی سُرخ ہو رہی تھی۔

"ہائے ہائے مر جائے گا بیچارہ، بھئی کوئی گاڑی مل جائے، ارے کسی اسپتال کو فون کرو۔" شیخ صاحب گھبرا کر بولے۔ محلّے کے اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس نے ٹارچ روشن کی، کئی آدمی زخمی پر جُھک گئے۔

"ارے!" ایک ساتھ کئی افراد کے منہ سے نکلا۔

"یہ تو افضلا ہے... افضلا..." "افضلے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا" بچّے شور مچانے لگے اور سارے لوگ افضلے کو اچانک اس طرح چھوڑ کر دس قدم پیچھے ہٹ گئے جیسے وہ کوئی ناپاک چیز ہو۔

"اس کی موٹر سائیکل کُھلے ہوئے مین ہول سے ٹکرا کر ہَوا میں اُچھلی ہے۔" شیخ صاحب اس جگہ کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

"دیکھ لیا، گٹر کے ڈھکن اُٹھوانے کا انجام!" کوئی اور بزرگ بولے۔

"مرنے دو کم بخت کو، جینا حرام کر رکھا تھا اس نے۔" کچھ اور آوازیں آئیں۔ افضلے کے سینے سے خون بہہ رہا تھا... وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ شاید بے ہوش تھا۔ اُسی وقت لائٹ آ گئی۔ لوگ اب ذرا دُور کھڑے افضلے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ جو موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ افضلا ان کے لیے اتنی قابلِ نفرت چیز بن چکا تھا کہ کوئی شخص اس کی مدد کے لیے تیار نہ تھا حتّٰی کہ ہجوم میں افضلے کے پالے ہوئے تین چار غنڈے بھی تھے۔ کسی نے ان کو دیکھ کر کہا۔

"ارے بالے، شیرے، کرمو، دیکھو تو تمھارا اُستاد مر رہا ہے، لے جاؤ... مرہم پٹّی کرو اس کی۔"

"مرتا ہے تو مرنے دو۔ اس نے ہمیں بھی کون سا سُکھ دیا ہے۔" یہ شیدے کی آواز تھی۔

"اور کیا، روز گالیاں، روز تھپّڑ، ہمیں تو اس نے جانور سمجھ لیا تھا۔" بالے نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ کرمو کچھ نہیں بولا، بس اُس نے نفرت سے ایک جانب تھوک دیا۔ پھر وہ تینوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک طرف کو چل دیے۔

ہجوم ابھی تک اپنی جگہ موجود تھا اور شیخ صاحب بڑے زور و شور سے افضلے کی بدمعاشیوں کا پچھلا ریکارڈ بیان کر رہے تھے۔ اسی وقت ایک لڑکا بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔ یہ رضوان تھا جو نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

"کیا ہوا یہاں؟" اُس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان پوچھا۔

"دیکھتے نہیں، افضلے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، وہ پڑا ہے۔" کسی نے کہا۔

"تو اِسے اسپتال لے جائیں۔" رضوان نے بے قراری سے کہا۔

"کیوں لے جائیں۔ مرنے دو اِسے، تمھیں پتا نہیں اس نے محلّے والوں کی زندگی عذاب کر رکھی تھی۔" شیخ صاحب لال

پہلے ہو کر گرجے۔

"کمال کرتے ہیں آپ" رضوان نے بھی غصّے سے کہا۔ "ایک شخص مَر رہا ہے۔ آپ کہتے ہیں مر جانے دو۔ جناب یہ بھی تو انسان ہے۔"

"شیطان کہو شیطان۔ انسانیت اس میں ہے کہاں؟" شیخ صاحب کے پڑوسی وکیل صاحب تیزی سے بولے۔

"کچھ بھی ہو اس کی جان بچانا آپ کا فرض ہے۔ اگر آپ اسے نہیں لے جائیں گے تو میں خود لے جاؤں گا۔" رضوان نے کہا اور ایک جانب دوڑ گیا۔

"باؤلا ہو گیا ہے۔" "کہیں یہ بھی افضلے کے ساتھ تو نہیں ملا ہوا ہے۔"

"اتنا سا لڑکا ہے، کسی چکّر میں پھنس جائے گا۔ ارے یہ تو پولیس کیس ہے۔" جتنے منہ اتنی باتیں۔

رِضوان دوڑتا ہوا واپس آگیا تھا۔ "میں نے اسپتال فون کر دیا ہے۔ ابھی ایمبولینس آتی ہوگی۔"

لوگ اب ذرا اور پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ سب رضوان کو سمجھا رہے تھے کہ وہ اس معاملے میں نہ پڑے لیکن رضوان ایک ہی بات دہرا رہا تھا: "یہ بھی تو ایک انسان ہے۔"

ذرا دیر میں ایک ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی آگئی۔ اس کی چھت پر لگا سُرخ بلب تیزی سے گھوم رہا تھا ایمبولینس میں سے دو آدمی اُترے انھوں نے اسٹریچر نکال کر افضلے کو اس پر ڈالا۔ اور اسٹریچر ایمبولینس میں رکھ دیا۔ رضوان بھی ان کے ساتھ ہی ایمبولینس میں سوار ہو گیا اور ایمبولینس سائرن بجاتی تیزی سے چلی گئی۔

افضلے کو ہوش آیا تو اس کا سینہ اور ایک ٹانگ پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی اور ایک ڈاکٹر اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔

"مبارک ہو جوان" ڈاکٹر نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ تو کہو تمھاری قسمت اچھی تھی، جان بچ گئی، اگر اسپتال پہنچنے میں ذرا سی اور دیر ہو جاتی تو تم تو گئے تھے اگلی دنیا میں۔ خون بہت بہہ گیا تھا تمھارا۔"

"مجھے ہوا کیا تھا ۔۔۔؟ شاید میں موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔" افضلے نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، ہاں، تم موٹر سائیکل پر جا رہے تھے، ایک کھُلے ہوئے مین ہول سے تمھاری گاڑی ٹکرا کر اُلٹ گئی، تم گاڑی کے ساتھ گھسٹتے ہوئے دُور تک چلے گئے۔ پھر تم زخمی حالت میں دیر تک وہیں پڑے رہے تھے۔"

"تو ۔۔۔ تو ۔۔۔ مجھے یہاں کس نے پہنچایا ۔۔۔؟" افضلے نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"ایک لڑکا ہے رضوان، وہ تمھیں لایا تھا ۔۔۔ روز تمھاری خیریت پوچھنے آتا ہے۔ تم چار دن بعد آج ہوش میں آئے ہو۔ اور یہ بھی سُن لو کہ تمھارے محلّے کا کوئی آدمی تمھیں اسپتال لانے کے لیے تیّار نہ تھا۔ بلکہ کئی افراد تو بعد میں آکر میری مِنّت سماجت کر رہے تھے کہ افضلے کو زیادہ دن اسپتال میں رکھوں تاکہ وہ جلدی تندرست ہو کر پھر انھیں پریشان نہ کرنے لگے۔" ڈاکٹر نے افضلے کے بستر کے قریب پڑی چھوٹی میز پر موجود فائل کھول کر کچھ لکھا اور وارڈ کے دوسرے مریضوں کو دیکھنے لگا۔

افضلا کچھ نہیں بولا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

"تو... سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، لیکن وہ لڑکا... کیا نام بتایا ڈاکٹر نے...؟ رضوان... کیا وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتا؟" اس نے سوچا۔

اس وقت وارڈ کے دروازے ایک لڑکا اندر داخل ہوا اور سیدھا افضلے کے بیڈ کی طرف آگیا۔ افضلے کو ہوش میں دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔

"کیسے ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"میں... میں ٹھیک ہوں، مگر تم کون ہو؟"

"میں رضوان ہوں..."

"تم... تم رضوان ہو...؟" افضلے نے حیرانی سے کہا، اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن رضوان نے اُسے جلدی سے تھام کر کہا: "لیٹے رہیئے، ہلیے مت۔ آپ کے سینے پر بہت چوٹیں آئی ہیں۔"

افضلے کے ایک ہاتھ میں ڈرِپ لگی ہوئی تھی اس نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر رضوان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"تم... تم یہ بتاؤ کہ تم نے میری جان کیوں بچائی۔ میں نے سُنا ہے کہ جب میرا ایکسیڈنٹ ہوا تو کوئی مجھے اسپتال لانے پر تیّار نہ تھا..." افضلے نے رُک رُک کر کہا۔

"اس لیے کہ آپ بھی ایک انسان ہیں" رضوان نے بڑی سادگی سے کہا۔

"انسان...!" افضلے نے آہستہ سے کہا۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحوں بعد اُس نے آنکھیں کھول کر بڑی دھیمی آواز میں کہا۔

"رضوان! محلّے والوں کو بتا دینا، اب میں ایک انسان ہوں، میری زیادتیوں کو معاف کر دیں... اللہ کے واسطے... انھیں بتا دینا کہ ایک معصوم لڑکے نے مجھے انسان بنا دیا ہے۔"

افضلا دوبارہ آنکھیں بند کرکے گہری گہری سانسیں لینے لگا تھا۔

عجیب درخت

حیدرآباد (سندھ) سے ۱۸ میل دور ایک گاؤں راجوخانی میں ایک ایسا درخت ہے جس کے تنے سے دودھ کی دھاریں بہتی رہتی ہیں۔ اس دودھ سے بہت سی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں روزانہ ہزاروں آدمی یہ دودھ حاصل کرتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس درخت کے آس پاس پانی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

(مرسلہ: عائشہ خالد، پی ای سی، ایچ ایس کراچی)

انعامی معمّہ :-

ان اشیاء میں سے دو دو چیزوں کے انگریزی نام ملا کر انگریزی کا کوئی ایک لفظ بنتا ہے ۔ مثلاً ہیئر پن وغیرہ ذرا آپ بھی اپنی ذہانت آزمائیے ۔

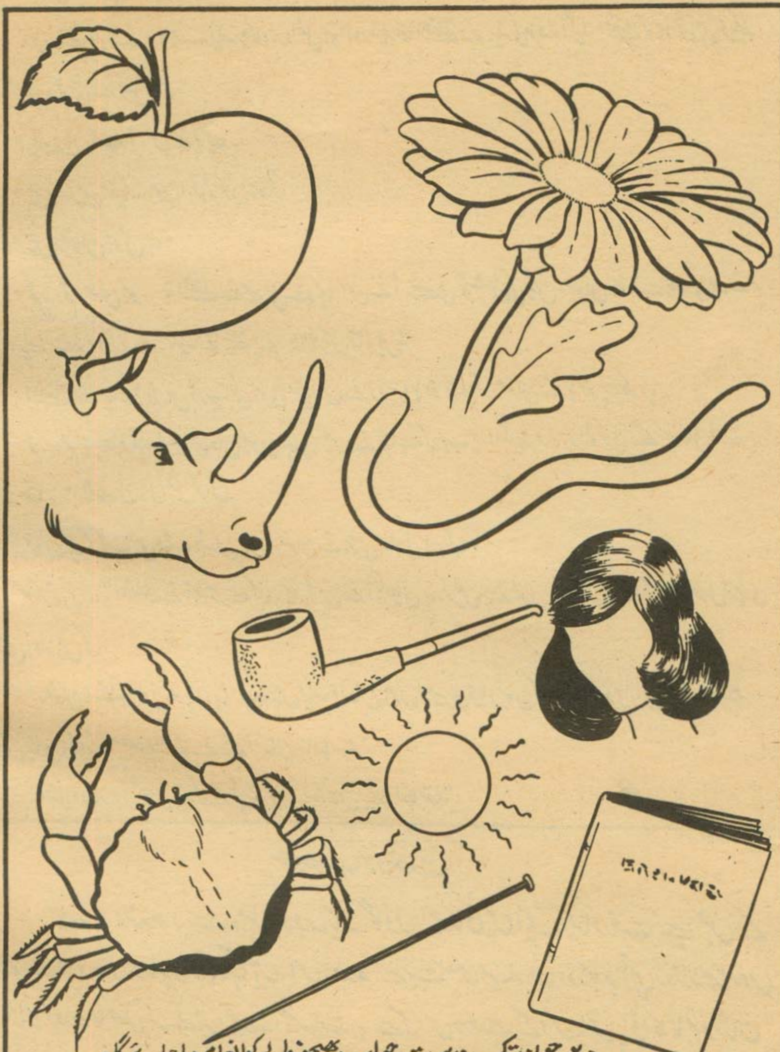

۲۰ر جون تک درست جواب بھیجنے والے کو انعام دیا جائے گا ۔

اُس ماہ کا انعامی لطیفہ

ایک عورت کی گود میں بچہ تھا۔ اور وہ رو رہی تھی۔ وہاں سے ایک خوش پوش آدمی گزرا تو اُس نے پوچھا "مائی کیوں روتی ہو؟"

عورت نے کہا "جناب، میرا بچہ بیمار ہے، ڈاکٹر کے پاس گئی تھی، وہ دوا کے دو روپے مانگتا ہے اور میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

خوش پوش آدمی نے اُسے دس کا نوٹ نکال کر دیا اور کہا "جاؤ دو روپے ڈاکٹر کو دے کر دوا لے آؤ اور باقی آٹھ روپے مجھے لا دو۔" عورت گئی اور تھوڑی دیر بعد دوا لا کر اُس نے آٹھ روپے اپنے محسن کو واپس کیے۔

خوش پوش نے کہا "شاباش! ہم سب کو نیکی کرنی چاہیئے۔ اب ہم سب خوش ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو فیس مل گئی، تمھیں دوا مل گئی اور میرا جعلی نوٹ چل گیا۔"

محمد رضوان اورنگی ٹاؤن، کراچی

ایک کنجوس شخص کو اُس کے دوستوں نے چندہ دینے کو کہا تو اُس نے جھٹ ہزار روپے کا چیک لکھ دیا۔ سب نے اُس کی تعریف کی اور کہا کہ اس پر دستخط کر دو تاکہ چیک مکمل ہو جائے۔

کنجوس بولا "معاف کیجئے گا، میں نیک کاموں میں اپنا نام پوشیدہ رکھتا ہوں۔"

نعمان طاہر ـــــــ بلال گنج لاہور

ایک سکھ ایک دکان میں گیا اور دکاندار سے پوچھا "یہ الماری کتنی کی ہے؟" دوکان دار نے کہا "ہم سکھوں کو چیز نہیں دیتے۔" لیکن سکھ کو وہ الماری بہت پسند آگئی تھی چنانچہ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ یہ الماری ضرور خریدے گا۔ دوسرے دن سکھ ایک غیر ملکی لباس میں دکان پر پہنچا، دکاندار اُسے دیکھتے ہی بولا "ہم سکھوں کو چیز نہیں بیچتے۔" تیسرے دن سکھ پھر ایک امریکی کے روپ میں دکان پر پہنچا۔ دکاندار اُسے دیکھتے ہی بولا "ہم سکھوں کو چیز نہیں بیچتے۔"

"سکھ بولا "بھائی نہیں بیچتے تو نہ بیچو لیکن یہ بتا دو کہ تم مجھ کو پہچان کیسے لیتے ہو۔؟"

دکاندار نے جواب دیا "بہت آسانی سے تم فریج کو

المارى کہتے ہو۔"

وحید ظفر ـــــــ سوسائٹی کراچی

اسکول میں بڑے ڈپٹی صاحب آنے والے تھے فکرمند استاد نے بچّوں کو سوالات کی مشق کرادی۔ مثلاً ایک لڑکے کو کہا۔"جب ڈپٹی صاحب پوچھیں کہ تمہیں کس نے بنایا ہے تو جواب دینا کہ ہمیں خدا نے بنایا ہے۔"

مقررہ وقت پر ڈپٹی صاحب آئے تو انھوں نے کلاس سے سوال کیا۔"تمہیں کس نے بنایا ہے؟" کلاس سے کوئی جواب نہ ملا۔ جب دوسری مرتبہ بھی پوچھا گیا تو ایک چھوٹی لڑکی نے کھڑے ہو کر کہا"سر! جس لڑکے کو خدا نے بنایا تھا، وہ آج اسکول نہیں آیا، اُسے بخار ہے۔"

رانا گلزار احمد ـــــــ ملتان

ایک انگریز اپنی شہریت کے کاغذات کی کارروائی مکمّل کرنے کے لیے عدالت میں گیا۔ جج نے پوچھا:"تم کہاں رہتے ہو؟"

انگریز:"کون، میں؟"

جج:"ہاں تم۔"

انگریز:"ڈونسی اسٹریٹ میں۔"

جج:"کیا کام کرتے ہو؟"

انگریز:"کون، میں؟"

جج:"ہاں۔"

انگریز:"میں درزی ہوں۔"

جج:"تمھاری عمر کیا ہے؟"

انگریز:"کس کی، میری؟"

جج:(چڑ کر) "نہیں میری"

"جناب یہی کوئی پچاس کے درمیان ہوگی" انگریز نے بڑے ادب سے کہا۔

محمّد اسحاق تبسّم ـــــــ ہری پور

دو ٹیموں کے درمیان کرکٹ میچ ہو رہا تھا ایک فیلڈر دن بھر میں کوئی کیچ نہ لے سکا۔ آخر کار بیٹسمین کی غلطی سے ایک بہت ہی آسان سا کیچ اس کی طرف آیا۔ اس نے کیچ پکڑ کر خوشی سے گیند کو ہوا میں اُچھالنا شروع کر دیا۔ ابھی اُسے گیند کو اُچھالتے ہوئے تھوڑی ہی سی دیر ہوئی تھی کہ کپتان بھاگتا ہوا آیا اور غصّے سے بولا"نالائق! یہ کیا کر رہے ہو؟ گیند واپس پھینکو، یہ نو بال تھا، دیکھو دونوں بیٹسمین تیسرا رن لے رہے ہیں۔"

فرزانہ روحی ـــــــ اورنگی ٹاؤن کراچی

ایک صاحب تقریر کر رہے تھے کہ ماضی کی ہر چیز کو بھول جاؤ۔۔۔

کہ پیچھے سے آواز آئی"مہربانی فرما کر آپ میرے دو سو روپے نہ بھولیے جو آپ نے مجھ سے قرض لیے تھے۔"

پرنس وسیم بن اشرف ـــــــ میاں چنوں

ٹانگ میں پھوڑا ہو جانے کے باعث ایک آدمی کو ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ڈاکٹر نے کہا"پھوڑا خطرناک ہے۔ اس لئے آدھی ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔"

چنانچہ اسے ایک ہفتے بعد آپریشن روم میں لے جا کر اسے کلوروفارم سنگھا دیا گیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو ڈاکٹر اس کے سرہانے کھڑا تھا۔

ڈاکٹر:"میں تمہیں دو خبریں سنانا چاہتا ہوں۔ ایک اچھی اور دوسری بُری۔۔۔ بُری خبر تو یہ ہے

کہ غلطی سے دائیں کے بجائے بائیں ٹانگ کاٹ دی گئی ہے۔ اور اچھی خبر یہ ہے کہ تمہارا پھوڑا اب زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

ادم ریاض ——— پھلیلی، حیدرآباد

"تم بہت خراب آدمی ہو" ایک موٹے شخص نے کہا۔۔۔

"اگر یہ الفاظ پھر منہ سے نکلے تو دانت توڑ دوں گا" دُبلے آدمی نے جواب دیا۔

"سمجھ لو، میں نے الفاظ کہہ دیے" موٹے آدمی نے کہا۔

"سمجھ لو کہ تمھارے دانت ٹوٹ گئے" دُبلا بولا۔

پرنس وسیم بن اشرف ——— میاں چنوں

دو بے وقوف آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پہلا بے وقوف: "یار مجھے سمجھ نہیں آتی کہ انڈوں سے بچے کس طرح نکل آتے ہیں؟"

دوسرا بیوقوف: "مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ بچے انڈوں میں کس طرح گھس جاتے ہیں؟"

محمد حامد بلال ——— کینٹ بازار، کراچی

شوہر: "میں جادوگری کے تماشے کے لیے دو ٹکٹ لایا ہوں"

بیوی: (جذباتی لہجے میں) "تمھیں میری تفریح کا کس قدر خیال رہتا ہے"

شوہر: "بات دراصل یہ ہے کہ جادوگر ایک انڈے کے چار آملیٹ بنا کر دکھاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی وہ جادو سیکھ لو!"

ممتاز احمد قریشی۔ مکلی

ایک کوچوان (دوسرے سے) "تم اپنے گھوڑے کو سُوکھی گھاس کھلا رہے ہو اور یہ بڑے شوق سے کھا رہا ہے، میرا گھوڑا تو نہیں کھاتا۔ آخر بات کیا ہے؟"

دوسرا کوچوان (خوشی سے) "تم کو پتہ نہیں ہے، میں نے اپنے گھوڑے کو ہرے شیشے کا چشمہ لگا رکھا ہے"

شفیع محمد ——— لانڈھی، کراچی

مالک (نوکر سے) "میں نے تمھیں کہا تھا کہ اشرف صاحب عین سات بجے آئیں گے اور تم سے سات ہزار روپے، جو میں نے تمھیں دیے تھے، لے جائیں گے۔ کیا تم نے انھیں دے دیے؟"

نوکر: "جناب وہ بھی عجیب آدمی ہیں وہ عین سات بجے آئے انھوں نے نقاب منہ پہ باندھ رکھا تھا انھوں نے مجھے گھونسا مارا اور سات ہزار روپے لے کر رفوچکر ہو گئے۔"

عامر اعجاز ——— ڈنگہ۔ گجرات

ایک صاحب نے ایک شخص کو صرف اس لیے ملازم رکھا کہ وہ اس کے پاؤں دبائے۔ لہٰذا ملازم اُن صاحب کے پاؤں دباتا رہا۔ ایک مہینے کے بعد جب ملازم نے تنخواہ کا مطالبہ کیا تو اُن صاحب نے کہا "تم نے ہمارے پاؤں دبائے، لہٰذا ہم نے تمھارے پیسے دبائے!"

احمد رضا ——— لیاقت آباد

قسط نمبر (۳)

دھماکہ

اظہر نیاز

اس بار جو دھماکہ ہوا تھا، وہ اتنا شدید تھا کہ اُس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ذیشان کو ان دھماکوں نے پریشان کر رکھا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ تخریب کار پکڑے کیوں نہیں جاتے؟ اس کے ابو آغا صاحب پولیس کے اعلیٰ افسر تھے اور پولیس اکیڈمی میں انسٹرکٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ دھماکوں کے سلسلے میں دو تخریب کار گرفتار کیے گئے مگر ان کی رہائی کے لیے سفارشیں آنے لگیں۔ ذیشان اپنے ابو کے ساتھ انھیں دیکھنے گیا۔ اُن میں سے ایک بلّی آنکھوں والا اور دوسرا عام سا آدمی تھا۔ اُن دونوں کو بالآخر انسپکٹر احمد نے رہا کر دیا۔ شام کو ذیشان اپنی سائیکل پر جا رہا تھا کہ اُسے بلّی آنکھوں والا کار سے اُتر کر جاتا نظر آیا۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور اُس کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ شخص ایک اسٹور سے "بلیک مین" پرفیوم خرید کر گاڑی میں چلا گیا۔ ذیشان واپس گھر چلا۔ راستے میں اُس کی سائیکل ایک موٹر سائیکل سے ٹکرا گئی، جس سے وہ دونوں گر گئے۔ گھر پہنچ کر ذیشان کو پتہ چلا کہ اُس کی جیب میں ڈائری نہیں ہے۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ اُس کی سائیکل سے ٹکرانے والا آدمی وہی تھا، جسے اُس نے بلّی آنکھوں والے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اگلے دن کوئی آدمی ڈائری واپس کر گیا۔ ذیشان فوراً سائیکل لے کر اُس کی تلاش میں نکلا اور بالآخر اُس تک جا پہنچا۔ وہ شخص اُس سے بڑی اپنائیت سے باتیں کرنے لگا۔ مگر ذیشان مسلسل خطرے کی بُو محسوس کر رہا تھا۔ اور اُس کا اندازہ درست ثابت ہُوا۔ کیوں کہ اُن کی باتوں کے دوران ایک جیپ اُن کے پاس آ کر رُکی اور دو آدمیوں نے ذیشان کو قابو کر کے اُسے گاڑی میں ڈال دیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اُسے "بلیک مین" خوشبو کا جھونکا محسوس ہُوا۔ آغا صاحب کو ذیشان کی گمشدگی کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوری طور پر اُس کی تلاش شروع کروادی۔ لیکن اُس کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ پھر ایک دن وہ بڑی خاموشی سے واپس آ گیا۔ آغا صاحب اور پولیس کے افسران، اُس سے معلومات کرنے لگے۔ مگر ذیشان کوئی خاص بات نہ بتا سکا۔ وہ اپنے طور پر بھی اُس جگہ کا سُراغ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا، جہاں اُسے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ یکایک فون کی گھنٹی بجی اور نامعلوم شخص نے آغا صاحب کو دھمکی دی کہ وہ ان کے راستے سے ہٹ جائیں، ورنہ خطرناک نتائج کے لیے تیار رہیں (اب آگے ملاحظہ کیجیے)

اعلیٰ پیمانے کی ایک خفیہ میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ تمام سینما گھروں، جمنازیم، ثقافتی مراکز جہاں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں ان کی نگرانی کا خاص اہتمام کیا جائے۔ اس فیصلے کے ٹھیک دوسرے دن لاہور کے ایک بہت بڑے جلسۂ عام میں بموں کے دھماکے ہوئے کئی سرکاری اور عالمِ دین شہید ہوئے اور جلسے میں آنے والے عوام کی کثیر تعداد سخت زخمی ہوگئی۔ ملک گیر ہڑتالیں، جلسے جلوس اور توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ کراچی کے ایک بارونق بازار میں دھماکہ ہوگیا۔

عوام سخت غیظ و غضب میں آگئے اور اب تو انھیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ عوام کا خیال تھا کہ یہ حکومت کی کمزوری ہے اور وہ صورتِ حال سے نمٹنے کی اہل نہیں اور یہ وہی لوگ تھے جو دراصل کسی ہنگامے کے لیے کسی نہ کسی بہانے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ پھر وہی توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہوگیا اور آغا صاحب اپنے افسران سے کہہ رہے تھے "آپ لوگوں نے بھی یہ نہیں سوچا کہ اس دفعہ دھماکہ بازار میں ہوگا ہم نے بازاروں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔"

"سر! اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔" ایک افسر نے کچھ کہنا چاہا۔

"جی فرمایئے!"

"سر! میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو فیصلہ ہم میٹنگ میں کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح تخریب کاروں تک پہنچ جاتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

آغا صاحب سمیت کئی دوسرے افسروں نے اس پولیس افسر کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر! میں معذرت کے ساتھ پھر کہوں گا مجھے اپنے ساتھیوں پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم جو فیصلہ کرتے ہیں تخریب کار اس سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہم نے سینماؤں کی نگرانی شروع کی تو دھماکہ بازار میں ہوا اب ہم بازاروں کی نگرانی کریں گے تو دھماکہ کسی اور جگہ ہوگا۔"

"یہ تو ایسی بات نہیں ہے۔" انسپکٹر احمد نے کہا۔

"صاف ظاہر ہے جہاں نگرانی ہو رہی ہوگی وہاں دھماکہ نہیں ہوگا۔"

"بات یہ نہیں ہے۔ جہاں نگرانی ہو رہی ہوتی ہے اس کا علم بھی صرف پولیس کو ہوتا ہے کسی دوسرے آدمی کو علم نہیں ہوتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ ہم وہاں چاروں طرف باوردی پولیس فورس کھڑی کر دیتے ہیں۔ آپ پولیس افسر ہیں انسپکٹر احمد، اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارا طریقۂ کار ذرا مختلف ہے جس طرح ہم غلطی نہیں کرتے اسی طرح تخریب کار

بھی غلطی نہیں کرتے۔ وہ جہاں دھماکہ کرتے ہیں انھیں سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ وہاں حفاظت کے انتظامات نہیں ہیں"۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں"؟ انسپکٹر احمد نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں جو کہنا چاہتا تھا کہہ چکا ہوں"۔ اس افسر نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

اور اس سے پہلے کہ تلخی بڑھتی آغا صاحب نے سب کو خاموش کر دیا۔

"مائی فرینڈز، مائی فرینڈز"۔ انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"اب ہمیں سوچنا یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ کار کیا ہوگا۔ یا کیا ہونا چاہیئے۔ ہمارے پاس اتنی خفیہ پولیس تو نہیں ہے کہ ہر کونے پر کھڑی کر دیں۔ اور پھر یہ کوئی مناسب بات بھی نہیں۔ بہر حال ہمیں جلد از جلد ان کا قلع قمع کرنا ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ہر افسر ایک دن کے اندر اندر اپنا ماسٹر پلان بنا کر لائے۔ تمام ماسٹر پلان پر باری باری۔۔۔ گفتگو ہوگی اور گرینڈ ماسٹر پلان تیار کیا جائے گا اور پھر اس کی روشنی میں کوئی قدم اٹھایا جائے گا"۔

جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی ذیشان چھپ کر میٹنگ کی ساری کارروائی سُن رہا تھا۔ جوں ہی میٹنگ ختم ہوئی وہ جلدی سے جا کر اپنے کمرے میں سو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ صرف میٹنگ کرتے رہتے ہیں۔ اگر اُسے کسی طرح تخریب کاروں کے اڈے کا پتہ چل جائے تو وہ اُسے اُن ہی کے بموں کے دھماکے سے اُڑا دے اور وہ یہ سوچ کر سو گیا کہ کل پھر وہ تخریب کاروں کے اڈے کی تلاش میں نکلے گا۔

انسپکٹر جاوید جو کہ ہر میٹنگ میں موجود ہوتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ آغا صاحب کے گھر میں کوئی آدمی ہے جو تخریب کاروں کو تمام کارروائی بتا دیتا ہے۔ انسپکٹر صدیقی کا خیال تھا کہ نہیں آدمی نہیں ہے بلکہ انھوں نے آغا صاحب کے گھر میں کوئی چھوٹا سا ٹرانسمیٹر یا ایف ایم مائیک چھپا رکھا ہے۔ جو ان کی آواز باہر پہنچا دیتا ہے۔ اس خیال کو ٹیسٹ کرنے کے لیے گھر کی تلاشی کے علاوہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ میٹنگ آغا صاحب کے گھر کی بجائے کسی دوسرے خفیہ مقام پر رکھی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور نتائج حوصلہ افزا برآمد ہوئے۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ تخریب کاروں نے دھماکوں کی بجائے خانہ جنگی کی فضا کو ہوا دینا شروع کر دیا اور انھوں نے اپنے اس کام کا آغاز کراچی سے کیا۔

صبح ناشتے پر جب ذیشان پہنچا تو اُس نے اخبار اپنے ابو کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"ابو آپ دیکھ رہے ہیں یہ کیا ہو رہا ہے اور یہ کون لوگ ہیں؟ ابو یہ وہی ہیں جو دھماکے کرتے ہیں۔ آپ کچھ نہیں کریں گے"۔

آغا صاحب آج کی خبر سے سخت پریشان تھے۔ انھوں نے ذیشان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ذیشان اپنی امّی کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور اخبار پڑھنے لگا جس میں کراچی میں ہونے والے فسادات کی خبریں تفصیل سے درج تھیں۔

ذیشان نے پوری خبر پڑھنے کے بعد اپنے ابّو سے کہا!

"ابّو! آپ نے اس سارے واقعے میں پولیس کے کردار پر غور کیا؟"

آغا صاحب سخت غصّے میں تھے۔ اُنھوں نے اپنی چھڑی اور ٹوپی اُٹھائی اور پیر پٹختے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔

● آغا صاحب نے چند لوگوں کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ اس کے تمام ملازموں پر کڑی نگاہ رکھیں اور ایک ٹیم سے کہا کہ وہ تمام گھر کو چیک کریں کہ کس جگہ ٹرانسمیٹر موجود ہے۔ گھر کا ایک ایک کونہ چھان مارا گیا۔ جدید ترین آلات سے تلاشی لی گئی لیکن ٹرانسمیٹر یا مائیکروفون نام کی کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی۔

اتنے میں ذیشان اپنے ایک دوست کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔

"ابّو آپ کو معلوم ہے آج حیدرآباد میں اور کراچی کے ہنگاموں میں مزید ۲۲ افراد ہلاک ہوگئے" ذیشان نے پریشان لہجے میں کہا۔

"بیٹے ذیشان میں نے تم کو منع کیا تھا کہ زیادہ باہر نہ رہا کرو۔ پھر تم بغیر بتائے نکل جاتے ہو کم از کم اپنی امّی کو بتا کر جایا کرو کہ تم کہاں ہو"۔ آغا صاحب نے کچھ پیار اور کچھ ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ابّو یہ میرے دوست ہیں طارق۔ میں ان کے گھر میں تھا۔ یہ ساتھ والی گلی میں ان کا گھر ہے اور طارق میرے ہی اسکول میں پڑھتا ہے۔ اکیلا بیٹھا بور ہو رہا تھا تو اس کے گھر چلا گیا اور اب ساتھ ہی لے آیا ہوں۔ اب ہم اپنے کمرے میں کیرم کھیلیں گے"۔

"اچھا ٹھیک ہے" آغا صاحب نے کہا۔ "اور جب بھی کہیں جاؤ تو کسی کو ساتھ لے کر جایا کرو"۔

"رائٹ سر!" ذیشان نے آغا صاحب کو سلوٹ کیا اور آغا صاحب کا موڈ ٹھیک ہوگیا اور وہ مُسکرانے لگے۔

ان کا ایک ہی بیٹا تھا اور اُنھیں تخریب کاروں سے سخت پریشانی تھی وہ لوگ آغا صاحب کو بلیک میل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اتنے میں خفیہ کا ایک آدمی جو گھر میں جدید ترین آلات سے ٹرانسمیٹر کی تلاشی میں مصروف تھا۔ آغا صاحب کے قریب آیا اور آہستہ سے کہا۔

"ٹرانسمیٹر ذیشان بابو کے کمرے میں موجود ہے"۔

"ٹھیک ہے ذیشان کے کمرے کی تلاشی لی جائے لیکن اس وقت جب ذیشان اپنے کمرے میں موجود نہ ہو"۔

آغا صاحب نے خفیہ پولیس کے آدمی سے کہا اور خود اپنے کمرے میں چلے گئے اور پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگے۔

شام کو ذیشان مولوی صاحب سے پڑھنے کے لیے ڈرائنگ روم میں گیا تو اس کے کمرے کی جدید ترین آلات سے تلاشی لی گئی لیکن کسی قسم کے ٹرانسمیٹر سگنل کی نشاندہی نہ ہوئی، آغا صاحب کو آگاہ کیا گیا تو وہ اور بھی پریشان ہوئے کہ چکر کیا ہے وہ بار بار پولیس افسر سے پوچھ رہے تھے۔ "لڑکے غلطی تو نہیں ہوئی" اور وہ کہہ رہا تھا۔ "غلطی اگر ہوئی ہے تو ان آلات سے ہوئی ہے مجھ سے غلطی نہیں ہوئی"۔

"اچھا تم جاؤ"۔ آغا صاحب اُلجھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

"رائٹ سر!" اس نے سلوٹ کیا اور چلا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر آغا صاحب کے پاس موجود تھا۔

"سر! ٹرانسمیٹر موجود ہے"۔

"کہاں"! آغا صاحب نے پوچھا۔

"ڈرائنگ روم میں۔ جہاں ذیشان بابو، مولوی صاحب سے پڑھ رہے ہیں اور سر! پولیس افسر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مجھے شک ہے کہ ذیشان اور مولوی صاحب کے درمیان کوئی چکر ہے۔ ٹرانسمیٹر ذیشان کے کمرے میں تھا اور اب اُسے ذیشان اپنے ساتھ لے گیا ہے کہ مولوی صاحب کے حوالے کر دیا جائے یا وہ دونوں بیٹھ کر کوئی پیغام دینے کی کوشش کریں گے یا پھر یہ مولوی صاحب آپ کے بیٹے سے تمام خبریں لے کر تخریب کاروں تک پہنچاتے ہوں گے۔ میرے خیال میں مولوی صاحب کو فوراً گرفتار کر لینا چاہیئے"۔

"لڑکے! یہ مناسب نہیں ہے"۔ آغا صاحب نے کہا اور پولیس افسر کو اشارہ کیا۔

"میرے ساتھ آؤ"۔ دونوں ڈرائنگ روم سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے اور سُننے لگے۔ مولوی صاحب نے پُرانا سبق سُنا، نیا سبق دیا۔ دو تین مرتبہ اُسے دہرایا اور پھر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔ اور ذیشان نیا سبق دُہراتا رہا۔

قل ھواللہ احد   کہو اللہ ایک ہے۔

اللہ الصمد   اللہ سب سے بے نیاز ہے۔

لم یلد ولم یولد   نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔

ولم یکن لہٗ کفواً احد   اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد مولوی صاحب اُٹھ کر چلے گئے اور ذیشان بھی ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے میں چلا گیا کوئی ایسی بات ان کے درمیان نہیں ہوئی۔ آغا صاحب نے پولیس افسر کی طرف دیکھا اور کوئی جواب نہ

پاکر اس سے کہنے لگے ۔

"تم بہرحال اب ڈرائنگ روم کی تلاشی لو۔"

"تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔ "مجھے کوئی سگنل موصول نہیں ہو رہا۔ مطلب یہ ہے کہ ٹرانسمیٹر اب اس کمرے میں موجود نہیں ہے۔"

"کیا بکواس ہے مسٹر شعیب!" آغا صاحب نے تلخی سے کہا ۔

"سر! آپ میری بات اب بھی مان لیں، مولوی صاحب کو گرفتار کر لیں، ذیشان نے ٹرانسمیٹر ان کو دے دیا ہے اور وہ لے کر چلے گئے ہیں۔"

"لڑکے اب تم بھی جاؤ۔" آغا صاحب نے کہا "اور کل اسی وقت پھر آجانا جب مولوی صاحب آتے ہیں۔"

"رائٹ سر!" انسپکٹر شعیب نے سلوٹ کیا اور چلا گیا ۔

دوسرے دن ٹھیک جب مولوی صاحب آئے اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے اور پھر ذیشان بھی ان کے کمرے میں چلا گیا تو آغا صاحب نے انسپکٹر کو اشارہ کیا اور وہ پھر کل کی طرح ڈرائنگ روم کے دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ ہونق چہرہ بنائے ہوئے آغا صاحب کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا۔

"سر! آپ نے بہت اچھا کیا جو کل مولوی صاحب کو گرفتار نہیں کیا۔"

"کیوں کیا ہوا۔" آغا صاحب نے پوچھا ۔

"ٹرانسمیٹر" انسپکٹر شعیب نے جواب دیا "دراصل ذیشان کے پاس ہے اور وہ کوئی بہت ہی مختصر سا ٹرانسمیٹر ہے جو ہر وقت اُس کے پاس رہتا ہے ۔ ذیشان کے ساتھ ساتھ چل کر بھی میں نے چیک کیا ہے۔"

"تم نے ذیشان سے اس بارے میں پوچھا تو نہیں ؟"

"نو سر!"

"رائٹ۔" آغا صاحب نے کہا۔ "ابھی تم میرے پاس ٹھہرو میں اُسے بُلاتا ہوں اور چیک کرتا ہوں اور تم اپنے آلات کی مدد سے خیال رکھنا کہ ٹرانسمیٹر اس کے پاس موجود ہے یا نہیں۔"

"رائٹ سر!"

آغا صاحب نے انٹر کام پر ذیشان کو اپنے کمرے میں بُلایا، وہ جوں ہی دروازے کے اندر داخل ہوا انسپکٹر شعیب نے اثبات میں سر ہلایا۔ جس کا مطلب تھا کہ ٹرانسمیٹر ذیشان کے پاس موجود ہے ۔

آغا صاحب نے ذیشان کو اپنے آپ سے لپٹا لیا اور پیار کرتے ہوئے اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھنے لگے "چھٹیوں کی وجہ سے بور تو نہیں ہو رہے۔ مولوی صاحب ٹھیک پڑھاتے ہیں۔ اسکول کا کام تو تم نے بتایا تھا کہ ختم کر لیا ہے یقیناً میرا بیٹا اس مرتبہ پھر فرسٹ آئے گا" وغیرہ وغیرہ۔ اور ان ہی باتوں کے درمیان انھوں نے اُس کی پوری تلاشی لے ڈالی۔ کوئی چیز اس کے پاس نہیں تھی۔

"ابّو! تخریب کاروں کا کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں بیٹے ابھی کچھ پتہ نہیں چلا؟"

"ابّو! آپ اُنھیں جلد تلاش کریں اور جب بھی تلاش کریں مجھے ضرور بتائیں میرے سامنے اُنھیں گولی ماریں"

"اچھا اب تم جاؤ۔ شاباش!" آغا صاحب نے کہا۔ ذیشان کمرے سے باہر نکلا تو انسپکٹر شعیب نے کہا۔

"سر! ٹرانسمیٹر ذیشان کے پاس موجود ہے"

"لیکن مجھے نہیں ملا" آغا صاحب نے کہا "اس کے پاس موجود نہیں ہے۔ میں نے بہت احتیاط سے اس کی تلاشی لی ہے"

"سر! انسان غلطی کر سکتا ہے لیکن آلات غلطی نہیں کرتے مجھے آلات یہی بتا رہے تھے کہ ٹرانسمیٹر ذیشان کے پاس ہے"

یہ کہتے کہتے ایک لمحے کے لیے تو انسپکٹر شعیب بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے آغا صاحب اصل حقیقت کو چھپا رہے ہوں اور انھیں پتہ چل چکا ہو کہ ان کا بیٹا تخریب کاروں کے لیے کام کر رہا ہے۔ دراصل مجھے خود ذیشان کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔ (باقی آئندہ) ●

مقبول نام

صرف (JOHN) ایسا نام ہے جو امریکہ میں سب سے زیادہ رکھا جاتا ہے اور امریکہ کے ہر گھر میں ایک دو فرد ایسے ضرور مل جائیں گے جن کے ناموں میں جان شامل ہوگا۔ امریکہ میں تقریباً ۵ لاکھ آدمی یہی نام رکھے ہوئے ہیں۔

مرسلہ: صبا حسن، کراچی۔

ایک بار ایسا ہُوا

جمّی اور ماریہ جب بھی شرارت کرتے تھے تو ان کے اسکول ٹیچر غصّے میں کہتے تھے "اگر تم لوگوں نے شرارتیں بند نہ کیں تو تمھیں اُلٹا لٹکا دیا جائے گا۔" اس دھمکی کو سُن کر دونوں سہم جاتے تھے اور شرارتیں بند کر دیتے تھے۔ ایک دن دونوں نے فیصلہ کیا کہ اُلٹا لٹک کر دیکھا جائے کہ کیسا لگتا ہے۔ واقعی یہ کام بے حد مشکل تھا لیکن اُنھیں مزہ بھی بہت آیا۔ جمّی کو تو ہر چیز اُلٹی دکھائی دے رہی تھی جیسا کہ آپ اس تصویر میں دیکھ سکتے ہیں۔ جمّی اور ماریہ کو اب اسکول ٹیچر کی دھمکی سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔

Interflow APL-100

Scanner

بستی آنکھ مچولی کی

تیسرا انعام یافتہ مضمون

عارف الرّحمٰن

میٹھا خیل

خوش باش لوگوں کی بستی

میرے گاؤں کا نام میٹھا خیل ہے۔ یہ صوبہ سرحد کی ایک نواحی بستی ہے۔ پہاڑوں سے گِھرا ہوا یہ قصبہ پندرہ سو گھرانوں پر مشتمل ہے۔ یہاں سبزے اور درختوں کی وہ کثرت ہے جسے دیکھ کر روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں کے حسین مناظر نظارۂ فطرت کی دعوت دیتے ہیں۔ رنگ برنگے خوبصورت پرندے درختوں پر اِدھر اُدھر پُھدکتے ہوئے خوبصورت گانے گاتے ہیں۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سبز کھیت اور سرسوں کے زرد پھُول روح کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔ رنگ برنگی تتلیاں پھولوں پر آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہیں۔ سبزہ زاروں میں گڈریے بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہَوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے مستی کی سی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ شاید جنّتِ اَرضی اِسی کا نام ہے۔

ہمارے گاؤں کے لوگ بہت جفاکش اور محنتی ہیں۔ سارا دن مشقّت کرتے ہیں اور اپنی محنت سے خالی زمینوں کو لہلہاتے کھیتوں میں بدل دیتے ہیں۔ اکثر آب پاشی ٹیوب ویل سے ہوتی ہے۔ تاہم اس مقصد کے لیے بارش کا پانی بھی زیرِ استعمال لایا جاتا ہے۔ یہاں زراعت کے وہی پُرانے طریقے رائج ہیں۔ اب آہستہ آہستہ زرعی آلات ان کی جگہ لے رہے ہیں۔

مکانات عمُوماً گارے مٹّی اور پتھروں سے بنائے جاتے ہیں۔ لوگ خود ہی مکانات تعمیر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں گاؤں کے لوگ بھی ایک دوسرے کی مَدد کرتے ہیں۔ اب پکّی اینٹیں بھی استعمال ہونے لگی ہیں۔

تعلیمی لحاظ سے ہمارا قصبہ پسماندہ رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہاں صرف پرائمری اسکول تھا۔ مگر اب ایک ہائی اسکول اور ایک زنانہ مڈل اسکول بھی تعمیر ہوئے ہیں۔ جس سے نوجوان نسل تعلیم کی طرف راغب ہو رہی ہے۔ اکثر بچے اور بچیاں اسکول جاتے ہیں، جو لڑکے اسکول نہیں جاتے وہ والد کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور پہاڑیوں میں مویشی چَرانے لے جاتے ہیں۔

لوگ صحت مند اور سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ توانائی سے بھرپور خالص غذائیں کھاتے ہیں۔ سبزیاں عمُوماً خود ہی اُگاتے ہیں۔ ہر گھر میں دُودھ، دہی اور خالص گھی کی فراوانی ہوتی ہے۔ لوگ اگرچہ دن بھر سخت مشقّت کرتے ہیں اور ان کو جدید ضروریاتِ زندگی میسّر نہیں پھر بھی وہ بڑی خوش اور قابلِ رشک زندگی گزارتے ہیں۔ ہر وقت خوش رہتے ہیں۔

حُجرہ سماجی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بڑا گاؤں ہونے کی وجہ سے یہاں کئی حُجرے ہیں۔ حجرُے میں سارے گاؤں والے مہمان ٹھہرتے ہیں۔ شادی اور غمی کے موقع پر یہ لوگ حجُرے میں جمع ہوتے ہیں۔ جب لوگ کاموں سے فارغ ہوتے ہیں تو وہ حجرُے میں چلے جاتے ہیں جہاں وہ خوب گپّیں ہانکتے ہیں اوران کی گفتگو کا موضوع عموماً کھیت اور فصل ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تفریح کے لیے حجرُے میں سازندے بھی بلوائے جاتے ہیں اور ڈھول کی تھاپ پر سب لوگ بے تحاشہ گول دائرے میں ناچتے ہیں۔

کبڈّی یہاں کا مقبول ترین کھیل ہے۔ چاندنی رات کی کبڈّی کا تو مزا ہی اور ہے۔ فصل کاٹنے یا بونے کے بعد جب لوگ فارغ ہوتے ہیں۔ تو اِردگرد کے دیہات کے نوجوانوں میں مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ جسے بڑے بوڑھے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ اس دوران وہ اپنی جوانی کا ذکر بھی شوق سے بیان کرتے ہیں کہ کبھی ہم بھی جوان تھے ان جیسے دو سورماؤں کو ایک ہی ہاتھ میں گرا لیتے تھے۔

حکومت نے علاج معالجہ کی سہولت کے پیشِ نظر ایک ڈسپنسری بھی کھولی ہے۔ جس میں مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ مرض کے خطرناک ہونے کی صورت میں مریض کو شہر لے جانا پڑتا ہے۔ گاؤں میں صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اور مَن کے کپڑے پر ایک دھبّہ بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لوگ فیشن سے ناآشنا ہیں۔ سادہ مگر پُروقار اور صاف لباس پہنتے ہیں۔ گلی کوچوں کو خود اپنی مدد آپ کے زرّیں اصولوں کے تحت صاف کرتے ہیں۔

یہاں کے لوگ مذہب کے بڑے پابند ہیں۔ لڑکے اور مرد پانچوں وقت باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ مرد مُرغ کی بانگ پر اُٹھتے ہیں اور نماز کے بعد کھیتوں میں چلے جاتے ہیں۔

کچھ نوجوان فوج میں بھی ملازمت کر رہے ہیں۔ حکومت نے ایک ڈاکخانہ بھی قائم کیا ہے۔ شہر تک پکّی سڑک جاتی ہے۔ آمدورفت عموماً کم ہی ہوتی ہے۔ مخصوص اوقات میں بسیں چلتی ہیں پھر سڑک ویران ہو جاتی ہے۔

گاؤں میں شادیاں عموماً رشتہ داروں میں ہوتی ہیں۔ لڑکی کے لیے پنجاب کے برعکس جہیز اور زیورات وغیرہ لڑکے والوں کو بنانے ہوتے ہیں۔ جس دن شادی ہوتی ہے اس سے ایک روز قبل عصر کے وقت سارے گاؤں والوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ پھر صبح کے وقت دلہن کو پالکی میں بٹھا کر اور پالکی اونٹ پہ رکھ کر دولہا کے گھر لائی جاتی ہے۔ اور یوں شادی انجام پاتی ہے۔ باراتی ہوائی فائر بہت زیادہ کرتے ہیں۔ اگر باراتیوں کے سامنے راستے میں کوئی پانی لائے تو دولہا والے اس کو پیسے دیتے ہیں۔

یہاں کے لوگ خود بھی خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔ سادہ اور پاک زندگی گزار رہے ہیں قناعت پسند ہیں۔ کسی قسم کی پریشانی اُن کو چھُو کر بھی نہیں گزری۔ کسی سے بھی دُشمنی اور کینہ نہیں رکھتے۔ سارے گاؤں والے ایک خاندان کی مانند جو ہیں۔

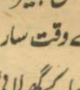

صبا خان

آخری کلمہ

شتیلہ کیمپ پر آج اسرائیلی طیّاروں کی جانب سے ہونے والی یہ تیسری بمباری تھی۔ لوگ جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ان کی چیخ و پکار نے دس ہزار افراد کی آبادی والے کیمپ میں قیامت برپا کر دی تھی۔ ہراساں وحشت زدہ مائیں اپنے ننھے مُنّے بچوں کو سینوں سے چمٹائے کسی محفوظ مقام کی تلاش میں تھیں۔ ہر طرف آگ کی بارش ہو رہی تھی اور بے شمار جسم خاک و خون میں لتھڑے ہوئے تڑپ رہے تھے۔

اسرائیلی طیّارے پانچ منٹ تک تباہی پھیلانے کے بعد چلے گئے اور کچھ دیر کے لیے ہر طرف سنّاٹا چھا گیا۔ پھر اِدھر اُدھر سے زخمیوں کی کراہیں بلند ہونے لگیں۔

بارہ سالہ قاسم کیمپ کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا اُن بچّوں کو ٹک ٹک دیکھے جا رہا تھا، جو اپنی

ماؤں کی آغوش میں کتنے مزے میں تھے۔ اُسے اپنی ماں کی محفوظ اور مہربان آغوش شدّت سے یاد آرہی تھی اور وہ چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بہت خوفزدہ ہو۔

اسی اثناء میں اُس کے دوست عبداللہ کی ماں اُدھر سے گزری تو اُس کی نظر کونے میں سہم کر اکڑوں بیٹھے ہوئے قاسم پر پڑی اور وہ لمحہ بھر ٹھٹکنے کے بعد بے اختیار قاسم کی طرف دوڑ پڑی۔

"اے میرے پاک پروردگار مجھے معاف کر دے ... میں اس یتیم کو بھول گئی ... آ... آ قاسم ... میرے پاس آ ... تو بھی تو میرے عبداللہ جیسا ہی ہے" یہ کہہ کر اُس نے قاسم کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر بھینچ لیا۔ بے آسرا قاسم کو یوں محبت ملی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

فلسطینی مہاجرین کی بستی شتیلہ، لبنان سے فلسطینی مجاہدین کے نکلنے کے بعد یہودی فوجیوں کے قبضے میں آگئی تھی۔ اور ان فوجیوں نے شتیلہ کیمپ پر قبضے کے بعد بستی میں ہر طرح کے امدادی سامان کی آمد پر پابندی عائد کر دی تھی۔ غذا، دودھ، پھل فروٹ، کھانے پینے کی اشیاء غرضیکہ وہ ساری چیزیں جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں ان کا داخلہ اس کیمپ میں منع تھا۔ اس پابندی کو آج بارہ دن ہو چکے تھے۔ کیمپ میں خوراک کی شدید قلّت پیدا ہو گئی تھی اور اب بچے، بوڑھے، جوان عورتیں کئی روز سے بھوکے تھے۔ ان کے پیٹ کی پسلیاں باہر کو نکل آئی تھیں۔ ان کے چہروں پر زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے، لیکن زندہ کیسے رہتے۔ ان میں سے کئی ایک دم توڑ چکے تھے لیکن غذا پہنچنے پر پابندیاں نرم ہونے کے بجائے روز بروز سخت ہوتی جا رہی تھیں

پھر کچھ اور وقت گزر گیا اور بالآخر آسمان نے اُس کیمپ میں وہ نظارے دیکھے کہ اگر وہ ستونوں پر قائم ہوتا تو ضرور ٹوٹ کر گر جاتا۔ بھوک سے بے حال ہو کر لوگوں نے شتیلہ کیمپ کے کتّوں اور بلّیوں کو مار مار کر کھانا شروع کر دیا صیہونی فوجی جب کسی کو کتّے یا بلّی کے پیچھے بھاگتے دیکھتے تو اُن کے لبوں پر مُسکراہٹ پھیل جاتی، ایک ایسی مسکراہٹ جو قطعی طور پر غیر انسانی تھی۔ اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیتے یا پھر زمین پر تھوک دیتے۔ ایسے لمحے ایک دن میں کئی بار آتے۔

رفتہ رفتہ شتیلہ کیمپ میں کتّے اور بلّیاں بھی ناپید ہونے لگے۔ اور لوگ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے دوسروں کی زندگیوں پر حملہ آور ہونے لگے۔

قاسم کئی روز سے اپنے اردگرد رہنے والے لوگوں کی نظروں کو بدلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ابھی کل ہی جب وہ نقاہت کے باعث نیم بے ہوشی کے عالم میں ایک ٹوٹے ہوئے گھر کے فرش پر پڑا تھا تو

سعد اور نور اُس کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے۔ اُن کی آمد پر جب قاسم نے آنکھیں کھول کر ان کی جانب دیکھا تو فوراً ہی بغیر کچھ کہے بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔ اور قاسم نے اُٹھ کر بڑی حیرت سے اُن کی طرف دیکھا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ قاسم عبداللہ کی ماں کے پاس لیٹا ہوا جاگنے کی کوشش کر رہا تھا. کہ یکایک اُسے عبداللہ کی ماں کی مدّھم آواز سنائی دی۔ وہ یاسر کی ماں سے کہہ رہی تھی۔

"خدا رحم کرے۔ سُنا ہے کچھ لوگوں نے فتویٰ دے دیا ہے کہ اگر زندگی بچانے کے لیے ضروری ہو تو..." اس سے آگے قاسم کچھ نہ سُن سکا کیونکہ اُسی وقت صیہونی فوجیوں نے قریب کی کسی گلی میں زبردست فائرنگ شروع کر دی تھی۔ فائرنگ تھوڑی دیر تک جاری رہی اور پھر اُس کے بعد ہر طرف اسی مانوس سی خاموشی نے اپنے پر پھیلا دیے۔

قاسم سوچ چکا تھا۔ عبداللہ کی ماں کچھ دُور فرش پر لیٹی ہوئی بھوک کی شدّت کے باعث نیم بے ہوشی کے عالم میں اِدھر اُدھر کروٹیں بدل رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

یکایک چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے تین افراد اُس ٹوٹے ہوئے گھر کے آنگن میں نمودار ہوئے اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے قاسم کے پاس آ گئے۔ اُن میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر قاسم کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ ہاتھ کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ فوراً ہی قاسم کی آنکھ کُھل گئی اور اُس نے اُس ہاتھ کی گرفت سے نکلنے کے لیے جھٹکے کے ساتھ اُٹھنا چاہا۔ تبھی وہاں موجود دوسرے دو افراد میں سے ایک نے اُس کے دونوں پاؤں کسی چیز سے کَس کر باندھ دیے اور قاسم بے بس ہو کر رہ گیا۔ تبھی قریب کی کسی گلی میں صیہونیوں نے ایک مرتبہ پھر فائرنگ شروع کر دی. فائرنگ کی آواز سے تھوڑے فاصلے پر لیٹی ہوئی عبداللہ کی ماں "یا خُدا خیر" کہتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے قریب ہی مدّھم سا شور سُن کر اِدھر توجّہ کی اور پَل بھر میں سب کچھ سمجھ کر چیختی ہوئی اُس سمت دوڑی لیکن اس سے پہلے کہ وہ وہاں تک پہنچتی دو مضبوط ہاتھوں نے اس کو ایک طرف دھکیل دیا۔

"خدا کے لیے اِسے چھوڑ دو ظالمو۔۔۔"

قاسم نے عبداللہ کی ماں کی آوازیں سُن کر ایک مرتبہ پھر اُس مضبوط ہاتھ سے نکلنے کی کوشش کی۔ اب تک اُس کی سمجھ میں سب کچھ آ چکا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے عبداللہ کی ماں نے یاسر کی ماں سے جس

فتوی کا ذکر سُنا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ انسانی گوشت کھانے کے سِلسلے میں ہے۔

یکایک قاسم نے اپنے گلے کی نرم کھال پر کسی آلے کی تیز دھار کو محسوس کیا۔۔۔ اُسی وقت آنگن کے کونے میں دو مضبوط بازوؤں کی گرفت میں جکڑی ہوئی عبداللہ کی ماں کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی وہ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

"کلمہ پڑھو میرے لعل۔۔۔ کلمہ پڑھو۔۔۔"

اور ننھے قاسم نے دِل ہی دِل میں کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔

" لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔۔۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ "

مصوّر

ایک نوجوان مصوّر نے اپنی مہارت ظاہر کرنے کی غرض سے ایک تصویر نہایت محنت اور کوشش سے تیّار کی اور اسے ایک بارونق بازار میں چوک پر لٹکا دیا۔ جس کے نیچے یہ عبارت لکھی "اس تصویر میں جہاں کہیں نقص ہو، وہاں پنسل سے نشان لگا دیا جائے۔"

نوجوان کو اپنے فن پر بہت ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ تصویر پر کوئی شخص پنسل سے ایک نشان بھی نہیں لگائے گا۔ لیکن نوجوان کی حیرت اس وقت انتہا کو پہنچ گئی، جب اس نے شام کے وقت جاکر دیکھا۔ تصویر پر پنسل کے اس قدر نشانات تھے کہ ان کے نیچے تصویر کی موجودگی پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ نوجوان بہت افسردہ اور مایوس ہوگیا۔ شام کو والد نے افسردگی کی وجہ پوچھی تو اس نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔

باپ نے کہا، "تم اسی طرح کی ایک تصویر اور بناؤ۔" نوجوان نے کافی محنت کے بعد اسی طرح کی ایک اور تصویر تیّار کی اور والد کو دکھائی۔ تو والد نے تصویر کے نیچے لکھ دیا۔ "اس تصویر میں جہاں کہیں نقص ہو تو درست کر دیا جائے۔"

تصویر اسی جگہ لٹکا دی گئی۔ شام کو نوجوان نے تصویر پر ایک بھی پنسل کا نشان نہ دیکھا تو بہت خوش ہوا اور گھر آکر والد کو یہ واقعہ سنایا تو والد نے کہا۔

"عیب نکالنا اور الزام دینا تو بہت آسان ہے۔ لیکن اس سے بہتر کر دکھانا بہت مشکل ہے۔"

مرسلہ: منوّر سلطانہ ــــــــــــ کراچی

عقیل عبّاس جعفری

گنی چُنی معلومات

(۱۱)

- زمین کے جتنے حصّے پر کاشت کی جاتی ہے وہ کُل زمین کے رقبے کا گیارہ فیصد ہے۔
- نظامِ شمسی کا سب سے بڑا سیّارہ مشتری، بلحاظِ قطر، زمین سے گیارہ گُنا بڑا ہے۔
- علّامہ اقبالؒ کے مجموعہ ہائے کلام کی کُل تعداد گیارہ ہے۔
- محمد غوری نے ہندوستان پر گیارہ حملے کیے تھے۔
- فورٹ ولیم کالج کے دور میں سب سے زیادہ کتابیں حیدر بخش حیدری نے لکھیں۔ ان کی تصانیف کی کل تعداد گیارہ تھی۔
- مشہور فلم بن حر نے گیارہ آسکر ایوارڈ حاصل کیے تھے۔
- پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ سرکاری طور پر ۱۹۱۸ء میں سال کے گیارہویں مہینے کے گیارہویں دن کے گیارہویں گھنٹے میں ہوا۔
- ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی کوششوں کا آغاز ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا۔ جب ۱۹۲۵ء میں یہ چوٹی سر ہوئی تو اس وقت تک گیارہ افراد اس چوٹی کو سر کرنے کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔
- تیل برآمد کرنے والے کی تنظیم اوپیک کے رکن ممالک کی تعداد گیارہ ہے۔
- امریکہ کا صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ، امریکہ کے گیارہ سابق صدور سے قرابت داری رکھتا تھا۔

(۱۲)

- قرآن پاک میں کل بارہ غزوات کا تذکرہ آیا ہے۔
- بیعتِ عقبہ اولیٰ کے موقع پر مدینہ کے بارہ افراد مشرّف با اسلام ہوئے تھے۔
- اب تک ۱۲ افراد چاند پر قدم رکھ چکے ہیں۔

گنی چنی معلومات

- اسکاؤٹ قانون کے مطابق ایک اسکاؤٹ بارہ خوبیوں کا مالک ہوتا ہے۔
- خطِ استوا پر دن اور رات، دونوں بارہ بارہ گھنٹے کے ہوتے ہیں۔
- پلوٹو، سورج سے بعید ترین فاصلے پر واقع ہے، وہاں چیزوں کا وزن زمین کی بہ نسبت ۱۲ گنا بڑھ جاتا ہے۔
- انسانی بدن میں پسلیوں کے بارہ جوڑے ہوتے ہیں۔
- سر والٹر ریلے نے اپنی مشہور کتاب ہسٹری آف دی ورلڈ، ٹاور آف لندن میں اسیری کے زمانے میں رقم کی تھی۔ وہ یہاں بارہ سال تک قید رہا تھا۔
- سمپلن سرنگ جو سوئٹزرلینڈ کو اٹلی سے ملاتی ہے، دنیا کی طویل ترین ریلوے سرنگ ہے۔ اس کی لمبائی بارہ میل ہے۔
- آپ نے بارہ مسالوں کی چاٹ کا نام اکثر سنا ہوگا۔ ان بارہ مسالوں سے مراد ہے۔ سفید زیرہ۔ سیاہ زیرہ۔ ہلدی پودینہ۔ الائچی۔ سیاہ مرچ۔ سونف۔ نمک۔ دھنیا۔ ادرک۔ اجوائن اور کلونجی۔

۱۳

- ابرہہ نے جب خانۂ کعبہ پر حملہ کیا تو اس کے لشکر میں ۱۳ ہاتھی تھے۔
- ۱۳ کا ہندسہ جاپان اور اٹلی میں خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔
- چین اور روس دونوں کی سرحدیں ۱۳، ۱۳ ممالک سے ملتی ہیں۔
- پاکستان میں اتوار کے بجائے جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل پہلی مرتبہ یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو دی گئی تھی اس دن اسلامی تاریخ تھی ۱۳ رجب ۱۳۹۷ھ۔
- امریکہ کے پرچم میں تیرہ پٹیاں ہیں۔ جو آزادی کے وقت امریکی ریاستوں کی تعداد کو ظاہر کرتی ہیں۔
- زمین چاند سے ایک سال میں جتنی روشنی حاصل کرتی ہے، اتنی سورج سے فقط ۱۳ سیکنڈ میں حاصل کر لیتی ہے۔
- ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ میں تیرہویں منزل نہیں ہے۔
- ملکہ قلوپطرہ تیرہ زبانیں جانتی تھی۔

گنی چنی معلومات

- اکبرِ اعظم تیرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا۔
- برّصغیر میں پہلی ریلوے لائن ۱۳ر مئی ۱۸۶۱ء کو کراچی اور کوٹری کے درمیان بچھائی گئی تھی

(۱۴)

- غزوۂ بدر میں ۱۴ مسلمان شہید ہوئے تھے۔ جن میں ۸ر انصار تھے اور ۶ر مہاجرین۔
- انگریزی شاعری کی مشہور صنف سانیٹ میں ۱۴ر مصرعے ہوتے ہیں۔
- ۱۴ر اگست، ۱۹۴۷ء کو جمعرات کا دن تھا اور اسلامی تاریخ تھی ۲۷ر رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ۔
- قائدِ اعظمؒ اور امریکی صدر وڈرو ولسن، دونوں اپنے ۱۴ر نکات کے لیے مشہور ہیں۔
- پاکستان میں ایک ہزار افراد کی آبادی کے لیے اوسطاً ۱۴ر اخبارات شائع ہوتے ہیں۔
- اس وقت دنیا میں ۱۴ر بادشاہ ہیں۔
- بھارت میں ۸۴۵ر زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جن میں سے ۱۴ر کو قومی اہمیت کی حامل زبانیں سمجھا جاتا ہے۔
- ۱۰۶۳ء میں دریائے ٹیمز شدید سردی کے باعث ۱۴ر دن کے لیے جم گیا تھا۔
- برِّصغیر کی پہلی بولتی فلم عالم آراء ۱۴ر مارچ ۱۹۳۱ء کو ریلیز ہوئی تھی۔
- بنواُمیّہ کے دور میں ۱۴ افراد تخت پر بیٹھے۔ جن میں سب سے آخری مروان بن محمّد تھا۔
- چین کی آبادی میں ہر سال ۱۴ء۱۶ ملین افراد کا اضافہ ہوجاتا ہے۔

(۱۵)

- پاکستان کے قومی ترانے میں ۱۵ر مصرعے ہیں۔
- دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کا نام، برّصغیر کے پہلے سرویئر جنرل سر جارج ایورسٹ کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس سے قبل یہ چوٹی PEAK XV یعنی چوٹی نمبر ۱۵ر کہلاتی تھی۔
- اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کے ارکان کی تعداد ۱۵ ہے۔

گنی چُنی معلُومات

- روس کا رقبہ، کل زمین کے رقبے کا ۱۵ر فیصد ہے۔
- امریکی ریاست ٹیکساس کا صدر مقام ۱۵ر مرتبہ تبدیل کیا جا چکا ہے۔
- فلپائن میں ۱۵ر سالہ لڑکا ووٹ ڈال سکتا ہے۔
- جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو قربانی کے لیے پیش کیا تو اُن کی عمر ۱۵ر سال تھی۔
- عالمی عدالت کے ججوں کی تعداد ۱۵ر ہے۔
- امریکہ کے دسویں صدر جان ٹیلر کے ۱۵ر بچّے تھے۔
- ریڈیو پاکستان سے ۱۵ر غیر ملکی زبانوں میں پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

(۱۶)

- ہجرت کے بعد حضور اکرمؐ نے سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی تھی۔
- دنیا کی پہلی مطبوعہ کتاب ڈائمنڈ سُترا کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۱۱ر مئی ۸۶۸ء کو ۱۶ر فٹ طویل اسکرول پر شائع ہوئی تھی۔
- ابراہام لنکن امریکہ کے سولہویں صدر تھے۔
- انسانی کھال کا وزن پورے جسم کے وزن کا سولہ فیصد ہوتا ہے۔
- غسل کرنا، تیل ملنا، سر گوندھنا، سر کو زیور سے آراستہ کرنا، چندن بھرنا، لباس پہننا، قشقہ کھینچنا، کاجل لگانا، گوشوارہ لٹکانا، ناک میں زیور یا موتی پہننا، گلے میں زیور پہننا، پھول یا موتیوں کا ہار گلے میں ڈالنا، مہندی لگانا، کمر میں گھنگرو والا کمر بند پہننا، پاؤں میں زیور پہننا اور پان کھانا، انھیں اصطلاحًا سولہ سنگھار کہا جاتا ہے۔
- برِ صغیر پر ۱۶ر انگریز گورنر جنرلوں نے حکومت کی۔
- رابرٹ بی ڈاونز نے اپنی کتاب "کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی" میں سولہ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

باقی صفحہ ۱۰۲ پر

قسط نمبر (۶)

تلاش

ستیہ جیت رے
ترجمہ : آصف فرخی

اُس کی آنکھ کھلی تو اُس پر انکشاف ہُوا کہ اُسے کچھ یاد نہیں۔ وہ اُس وقت سڑک کے کنارے ایک جنگل میں پڑا تھا اور اُس کے سر پر چوٹ آئی تھی۔ وہ اُٹھا اور گھسٹتا ہوا آگے بڑھا تو اُسے ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی نظر آئی، جس کی اگلی اور عقبی سیٹ پر دو آدمی ساکت پڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ آگے چلا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُسے کچھ یاد کیوں نہیں آرہا ہے؟ راستے میں پیڑوں پر بنے ہوئے سیاہ اور سفید حلقوں کو سمجھنے کی کوشش سے اُس کا سر شدت سے درد کرنے لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہوش میں آنے پر اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی اُسے دُودھ پیش کر رہا ہے۔ اُس آدمی نے اُس کا نام پوچھا تو وہ نہ بتا سکا۔ ایک اور آدمی کے مشورے پر اُسے پولیس اسٹیشن لے جایا جانے لگا۔ راستے بھر وہ لوگ اُس سے مختلف سوال کرتے رہے، مگر وہ ایک بات کا بھی جواب نہ دے سکا۔ وہ لوگ اُسے ایک ڈاکٹر کے پاس مرہم پٹّی کے لیے لے گئے، جہاں سے وہ غسل خانے کے راستے فرار ہوگیا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ریل کی پٹڑی پر جا نکلا اور وہاں سے ایک اسٹیشن پہنچ گیا۔ ریل گاڑی آئی تو وہ اس میں سوار ہونے لگا۔ مگر بھیڑ ہونے کی وجہ سے سوار نہ ہو سکا اور ریل چل پڑی۔ وہ ریل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا اور ایک کھلے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ اُسی وقت اندر سے ایک بازو نکلا اور کسی نے اُسے اندر گھسیٹ لیا۔ اندر گھسیٹنے والے شخص نے بھی اس سے بہت سے سوال کیے، مگر وہ اسے بھی کچھ نہ بتا سکا۔ ہاں البتہ اس نے اپنا ایک فرضی نام ارمانؔ احمد جمال بتایا۔ اس شخص کا نام ہارون الرشید تھا اور وہ ایک بازی گر تھا اور کرتب دکھاتا تھا۔ ہارون نے اُس سے کہا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ دوسری طرف ملک کے مشہور وکیل احمد علی دانیال اپنے بیٹے ببلو کی گمشدگی کے سلسلے میں انسپکٹر سے بات کر رہے تھے۔ انسپکٹر نے بتایا کہ چار آدمیوں نے ببلو کو اغوا کیا، راستے میں ان کی گاڑی کی ٹرک سے ٹکر ہوگئی۔ دو آدمی وہیں مر گئے اور دو آدمی سیمسن اور رگھوناتھ بھاگ گئے۔ ببلو گاڑی سے دُور جا گرا تھا۔ دانیال صاحب نے اس بات پر یقین نہیں کیا اور یہ کہہ کر انسپکٹر کے کمرے سے نکل آئے کہ اگر بدمعاشوں نے تاوان طلب کیا تو وہ رقم انھیں دے دیں گے۔ پھر پولیس مجرموں کو پکڑتی ہے یا نہیں، یہ اُس کا اپنا مسئلہ ہے۔ وہاں سیمسن اور رگھوناتھ نے شمالی کلکتہ پہنچ کر حلیہ تبدیل کیا اور اُس بوڑھے نجومی کے پاس پہنچے، جس کے پاس وہ اغوا کی واردات کے متعلق زائچہ معلوم کرنے گئے تھے۔ انھوں نے اسے غلط پیش گوئی کرنے پر لتاڑا اور ڈرا دھمکا کر فیس میں دیے گئے دس روپوں کے بدلے اُس کی ساری جمع پونجی سمیٹ لے گئے۔ اِدھر ہارون نے ارمان کو ابراہیم بابو کے ہوٹل میں ملازم رکھوا دیا۔ ارمان کچھ ہی دن میں اپنے کام میں مشاق ہوگیا۔ اب وہ تیزی سے گاہکوں کو چائے اور کھانا لا کر دیتا۔ وہ ابراہیم بابو کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اتوار کو اُس کی چھٹّی ہوتی تھی۔ اس اتوار کو ہارون اُسے شہید مینار لے گیا، جہاں میلہ لگا تھا اور لوگ قسم قسم کے تماشے دکھا رہے تھے۔ ہارون

نے بھی ایسے حیرت انگیز کرتب دکھائے کہ میلے کے سارے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس تماشے سے ہارون کو کافی آمدنی ہوئی۔ ارمان بدستور ابراہیم بابو کے پاس کام کرتا رہا۔ ایک دن ایک خوفناک شکل والا بدمعاش ایک معمولی شکل والے آدمی کے ساتھ ہوٹل میں آیا۔ اس نے ارمان سے اس کے متعلق کچھ سوالات کیے، جن کے ارمان نے اُلٹے سیدھے جواب دے کر جان چھڑائی۔ شام کے قریب ہارون اُسے اپنے ساتھ اپنا گھر دکھانے لے گیا۔ ارمان نے دیکھا کہ ہارون کا کمرہ بے شمار چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ ہارون نے اُسے اپنی آپ بیتی سُنائی کہ وہ کس طرح بازی گر بنا؟ پھر اُس نے محلّے کے بچّوں کو ایک ساتھ پانچ گیندیں اور آنکھوں پر پٹّی باندھ کر تین چھُریاں اُچھالنے کا حیرت انگیز کرتب دکھایا۔ کرتب کے بعد ہارون نے ارمان کو بتایا کہ اُس نے دو مشکوک آدمیوں کو دیکھا ہے، جو اب بھی باہر گلی میں کھڑے ہیں۔ اُن کا حلیہ سُن کر ارمان نے بتایا کہ وہ دونوں اُسے بھی چائے خانے میں ملے تھے۔ ہارون کا اندازہ تھا کہ وہ دونوں سیمسن اور رگھوناتھ ہیں جو گاڑی کے حادثے میں بچ گئے تھے۔ وہ ارمان کو پچھلے دروازے سے نکال لے گیا۔ وہاں احمد علی دانیال کے بنگلے میں اُن کے بیٹے بلو کی گمشدگی کے سلسلے میں اجلاس ہو رہا تھا جس میں انسپکٹر کے علاوہ اُن کے بیٹے بھی شریک تھے۔ انسپکٹر نے تجویز پیش کی کہ بلو کی بازیابی کے لیے اخباروں میں اشتہار چھپایا جائے، جس میں انعام کا بھی اعلان ہو۔ دانیال صاحب اس بات پر راضی ہو گئے۔ اب آپ آگے پڑھیے!

ارمان بے چین ہو رہا تھا۔ وہ آج صبح سے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ہارون آج دوپہر میدان میں پہلی دفعہ آنکھوں پر پٹّی باندھ کر بازی گری کے کرتب دکھانے والا تھا۔ جس دن سے ارمان اس کے گھر گیا تھا، ہارون روزانہ چائے خانے آتا رہا تھا۔ بعض دفعہ وہ دن میں دو مرتبہ آتا تھا۔ اس رات ارمان بغیر کسی مشکل کے، واپس چائے خانے پہنچ گیا تھا۔ شیام لال اور اس کے ساتھی نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اس دن ارمان کو معلوم ہوا کہ ہارون کو کلکتہ کی گلیوں سے کتنی اچھی واقفیت ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کا پیچھا بھی کرنا چاہتا تو ان گلیوں کے پیچ و خم میں اُلجھ کر رہ جاتا۔

ہر مرتبہ ہارون اس سے پوچھتا کہ وہ دو آدمی تو نہیں نظر آئے۔ وہ اس کے بعد پھر دکھائی نہیں دیے اور ارمان کو چائے خانے میں اتنا کام ہوتا تھا کہ اس کو فرصت نہیں ملتی کہ وہ باہر جا کر دیکھتا۔

ارمان اب اپنے کام میں ماہر ہو گیا۔ پہلے پہل وہ رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹتا تو اُس کے ہاتھ سُن ہو جاتے تھے۔ یہ کیفیت اب غائب ہو گئی تھی۔ جمعرات کے دن سے وہ کام کے بعد لکڑی کی دو گیندیں اُچھالنے کی مشق کرتا رہا تھا۔ یہ دونوں گیندیں، ایک زرد ایک سرخ، اس کو ہارون سے تحفے میں ملی تھیں۔

"یہ فن جو تم سیکھ رہے ہو" ہارون نے کہا تھا "اس کے ماہر آج سے پانچ ہزار سال پہلے مصر میں موجود تھے۔ صرف پانچ ہزار سال! نہیں، اس فن کے ماہر تو کائنات کی ابتدا سے چلے آئے ہیں، اربوں کھربوں سال پہلے!"

ارمان حیران رہ گیا۔ وہ سمجھا کہ ہارون مذاق کر رہا ہے لیکن ہارون سمجھانے لگا۔

"اب یہ جو ہماری دنیا ہے، یہ گیند نہیں تو اور کیا ہے؟ اسی طرح باقی سیارے ہیں۔ مرّیخ، زہرہ، عطارد، زحل، مشتری، یہ سب سورج کے گرد گھومتے ہیں اور چاند دنیا کے گرد گھومتا ہے، لیکن یہ کبھی ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں۔ ذرا سوچو۔ بازی گری کا اس سے بڑا کرتب کیا ہو سکتا ہے؟ رات کے وقت آسمان کی طرف دیکھنا تو تم میری بات کا مطلب سمجھ جاؤ گے۔ جب بھی تم ان گیندوں کو ہاتھ لگاؤ یہ بات یاد رکھنا۔"

وہ دونوں آدمی تو نظر نہیں آئے، مگر ہارون مستقل طور پر فکر مند تھا۔ بعض دفعہ ایسا لگتا کہ پریشانی کے علاوہ بھی کوئی بات ہے، مگر ارمان اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ بات کیا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ دیکھا کہ ہارون کی آنکھوں کی چمک

غائب ہوگئی ہے اور اس کی جگہ مایوسی نے لے لی ہے۔

اس قسم کے خیالات ارمان کے ذہن سے بہت دور تھے، جس وقت وہ میدان پہنچے۔ پچھلی اتوار کو ہارون نے جس جگہ کرتب دکھایا تھا، وہ بچوں سے بھری ہوئی تھی۔ ارمان نے ان میں سے کچھ کو پہچان لیا۔ وہ کانا لڑکا جس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے، وہ بونا جو دور سے چھوٹا لڑکا معلوم ہوتا تھا مگر قریب آنے پر اس کی ٹھوڑی پر اُگے ہوئے بال دیکھ کر اچنبھا ہوتا تھا۔ لنگی پہنے ہوئے وہ ڈھیلا ڈھالا سا لڑکا جس کے بڑے بڑے دانت آگے کو نکلے ہوئے تھے۔ ہارون کو آتے ہوئے دیکھ کر سب نے تالیاں بجانا اور شور مچانا شروع کر دیا۔

ہارون نے وہاں بیٹھتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ ارمان کو معلوم تھا کس لیے۔ مغربی اُفق پر کالے کالے بادل اُر رہے تھے۔ بارش سے تو سارا تماشا غارت ہو جائے گا۔ اللہ میاں، آج بارش نہ ہو! ہارون آنکھوں پر پٹی باندھ کر تماشا دکھائے تو سارا ہجوم سحر زدہ ہو جائے! آج اسے اٹھارہ روپے اور تیس پیسے سے زیادہ آمدنی ہو! کاش مجمع میں دو چار غیر ملکی ہوں! اور بھلا کس کے پاس پانچ اور دس کے نوٹ ہیں لٹانے کے لیے؟

ہارون نے اپنے معمولات شروع کیے تو دُور بادل گرج رہے تھے۔ لٹوؤں والا کرتب ختم کرکے اس نے ارمان کو اشارہ کیا۔ اس وقت لٹو اس کی ٹھوڑی پر گھوم رہا تھا۔ ارمان مجمع میں سے نکل کر اس کے برابر آن کھڑا ہوا۔ لٹو اب ہارون کی ہتھیلی پر گھوم رہا تھا۔ "اسے پکڑو" اس نے یہ کہتے ہوئے لٹو ارمان کے ہاتھ پر گرا دیا۔

گھومتا ہوا لٹو اس کی ہتھیلی کو گدگدانے لگا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسنی پھیل گئی۔ اب وہ ہارون کا مددگار نہیں تھا۔ آج وہ اس کا شاگرد بن چکا تھا۔

ہارون نے دوسرا لٹو لیا اور اُسے اپنے سیدھے ہاتھ پر گھمانے لگا۔ ارمان نے پہلا والا لٹو اس کے اُلٹے ہاتھ پر منتقل کر دیا۔ اس کے بعد دو گھومتے ہوئے لٹوؤں کے ساتھ زبردست کرتبوں کا مظاہرہ ہوا۔

دھات کی گیندوں کے کرتب کے بعد اس نے دوبارہ ارمان کو طلب کیا۔ ہارون نے ریشمی رومال نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا۔ ارمان نے وہ رومال اس کی آنکھوں پر باندھا تو مجمع میں حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ لیکن ارمان کو معلوم تھا کہ اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ ہارون کے لیے پہلے ہی دُنیا میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسے اس کرتب کے لیے کسی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔

گیندیں ہوا میں اُچھلیں اور چار چکّر لگائے۔ پانچویں دفع جو کچھ ہُوا۔ ارمان تو یہی پسند کرتا کہ ایسا نہ ہُوا ہوتا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ آسمان اس کے سَر پر گر پڑتا۔

دو گیندیں بیچ میں ٹکرا گئیں، اور کانوں کو جھنجھنا دینے والی آواز کے ساتھ اپنے راستے سے ہٹ گئیں اور زمین پر

گر پڑیں۔ زمین پر گر کر دونوں گیندیں لڑھکتی ہوئی ہارون سے دُور جانے لگیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مجمع کا تاثر تھا۔ اب تک وہ تالیاں بجا رہا تھا۔ نعرے لگا رہا تھا۔ اب وہ بے تحاشا ٹھٹھے مارنے لگا اور ہارون پر آوازیں کسنے لگا۔

لیکن زیادہ دیر کے لیے نہیں۔ پانچ منٹ میں مجمع چھٹ گیا۔ وہ جگہ ویران ہو گئی۔ اس دوران ہارون نے اپنی آنکھوں کی پٹی کھول ڈالی، اپنی چیزیں جمع کیں اور انھیں تھیلے میں بھرنے لگا۔ ارمان گھاس پر پڑے ہوئے پیسے جمع کرنے کے لیے جھکا لیکن ہارون نے اُسے ڈانٹ کر منع کر دیا۔ پھر گھاس پر بیٹھے بیٹھے اس نے بیڑی سلگائی۔ ارمان اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا دل نہیں چاہا کہ کچھ کہے۔ چورنگی کے ٹریفک کی آواز اس کے کانوں میں آنے لگی۔ یہ آواز پچھلی مرتبہ تو نہیں سُنائی دی تھی۔ بلکہ تھوڑی دیر پہلے بھی نہیں سُنائی دے رہی تھی۔

ہارون نے دو تین کش لگانے کے بعد بیڑی پھینک دی، اور کہنے لگا "تم جانتے ہو، ارمان کہ ہاتھ بھی ذہن کا حصّہ ہوتے ہیں؟ جب ذہن اُداس ہو تو ہاتھ سخت اور بے جان ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں پر پٹّی باندھ کر کرتب دکھانے کی چھٹی، اس وقت تک جب تک کہ مجھے یہ نہ پتا چل جائے کہ تمھارے ساتھ کیا کروں۔"

یہ کس قسم کی گفتگو تھی؟ ارمان حیران ہو گیا۔ وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہارون اب اس کے ساتھ اور کیا کرنا چاہتا تھا؟ ہارون کہتا رہا "جس وقت میں نے شیام لال کو دیکھا، پوری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ تمھیں پکڑ لانے کے بعد وہ گاڑی میں فرار ہو رہے تھے۔ وہ تمھیں اس وقت تک چھپائے رکھتے جب تک کہ تمھارے والد تاوان کی رقم ادا نہیں کر دیتے۔ حادثے کی وجہ سے ان کے منصوبے میں کھنڈت پڑ گئی۔ شیام لال اور وہ دوسرا تو بچ گئے لیکن دو ساتھیوں کا کام تمام ہو گیا تمھیں زمین پر گرا ہوا دیکھ کر شاید وہ سمجھے ہوں کہ تم بھی مر چکے ہو۔ اس لیے وہ تمھیں وہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اُس دن ابراہیم کے چائے خانے میں تمھیں دیکھ کر انھیں اپنا شکار پھر قریب آتا ہوا نظر آیا۔ اس رات تمھیں چھوڑ کر میں واپس آیا تو وہ دونوں وہیں منڈلا رہے تھے۔ وہ گیارہ بجے رات تک وہیں رہے۔ جب وہ گئے تو میں نے ان کا پیچھا کیا اور پتا چلا لیا کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ اگر میں پولیس کو خبر کر دوں تو وہ چٹکی بجانے میں پکڑے جائیں۔ لیکن اس سے بات صاف نہیں ہوگی۔ مجھے تم کو بھی پولیس کے حوالے کر دینا چاہیئے۔"

"نہیں، نہیں، ہارون بھیّا!"

"میں سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تم کیا محسوس کر رہے ہو۔ اسی لیے میں کچھ نہیں کر پا رہا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم کون ہو ۔۔۔۔ اس سے بہت فرق پڑ جاتا۔ اب تمھیں پولیس کے حوالے کرنا ایسا ہی ہے جیسے سڑک کے بے نام کتّے کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔"

ارمان کا دِل کسی نے زور سے مسوس ڈالا۔

"تیرک کا کتنا بھلا کرتب دکھا سکتا ہے ؟" اس نے پوچھا۔

ہارون مُسکرانے لگا اور اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم سیکھ رہے ہو ؟"

"اور آپ کا کیا خیال ہے ؟" ارمان کا دل دُکھ گیا تھا" سارے دن کام کرنے کے بعد سونے سے پہلے روزانہ ایک گھنٹہ "

اس نے جیب سے دو گیندیں نکالیں اور ہارون کے سامنے کر دیں۔

"چلو اچھا ہے" ہارون نے کہا " میں دو ایک دن اور انتظار کیے لیتا ہوں۔ اگر کسی نے تمھارے بارے میں نہیں پوچھا تو تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا"

"کہاں ؟" ارمان حیران رہ گیا۔ یہ تو پہلی مرتبہ تھا کہ ہارون نے کہیں جانے کا ذکر کیا تھا۔

"ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔ کل مجھے دینکٹیش کا خط ملا۔ وہ چاہتا ہے کہ میں جنوب کی طرف چلا جاؤں۔ اور میں بھی زمین پر سے سکّے چُن چُن کر بے زار آچکا ہوں۔ اس کو بہت ---"

"یہ لڑکا کون ہے ؟ تمھارا جمورا ؟"

یہ الفاظ اتنے اچانک کہے گئے کہ ارمان کا دل اُچھل کر اُس کے حلق میں آگیا۔

دو آدمی اندھیرے میں چُپ چاپ ان کے پیچھے آن کر کھڑے ہو گئے۔ شیام لال کی ٹیڑھی خم دار ٹانگ ارمان کے داہنے کندھے کے پاس تھی۔

ارمان نے دیکھا کہ چاقو کا چمکتا ہوا پھل اس کے سر کے پاس سے گزرا، اور اس کے اور ہارون کے درمیان رُک گیا۔

ہارون کن انکھیوں سے شیام لال کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ سکّے اٹھا لو، رگھو! ان پیسوں سے چندا کے ہاں ہمارا قرضہ اُتر جائے گا"

دوسرا آدمی جھکا اور ان کے سامنے گھاس میں بکھرے ہوئے سکّے چُننے لگا۔

"چلو، جواب دو۔ میں سُننا چاہتا ہوں ..."

شیام لال اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔ ارمان نے دیکھا کہ وہ تھیلا اور اس کے اندر دھات کی گیندیں، چھُریاں اور لٹّو سمیت، راکٹ کی طرح ہوا میں بلند ہوا۔ شیام لال کے جبڑے سے ٹکرایا اور اُسے زمین پر گرا دیا۔

"ارمان !" ہارون چلّایا۔

ارمان آندھی کی رفتار سے ہوا میں اُڑا جا رہا تھا۔ اُسے ہارون نے اُٹھایا ہُوا تھا۔ شہید مینار کے چاروں طرف آندھی آ رہی تھی۔ لوگ پناہ کی تلاش میں چورنگی کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔

"کیا تم بھاگ سکتے ہو؟"

"ہاں!"

ارمان کے پیروں نے زمین کو چھُوا۔ وہ فوراً دوڑنے لگا، ہارون کے ساتھ ساتھ جو ایک طرف کھڑی ہوئی گاڑیوں کا رُخ کیے ہوئے تھا۔

"ٹیکسی!"

زور سے بریک لگے اور گاڑی کا دروازہ کھُل کر ارمان کے سامنے آگیا۔

"سینٹرل ایونیو!"

آگے دوسری سواریاں تھیں --- ٹیکسیاں، بسیں، اسکوٹر، سائیکلیں۔ ارمان اور ہارون نے پیچھے دیکھا۔ شیام لال اور رگھو ناتھ آندھی طوفان میں تیز تیز بھاگتے ہوئے اُن کی جانب چلے آ رہے تھے۔ ابھی تک دن کی تھوڑی سی روشنی باقی تھی لیکن سڑکوں کی بتّیاں جل اُٹھی تھیں۔ دکانوں کی بتّیاں بھی جل گئی تھیں۔

سامنے جگہ پا کر ٹیکسی نے رفتار پکڑلی۔

"دوست، تمھیں زیادہ پیسے دُوں گا" ہارون نے آگے جُھک کر ڈرائیور سے کہا "تیز چلو"

ٹیکسی دائیں کو مُڑی اور آندھی سے مقابلہ کرتی ہوئی چورنگی سے نکلی۔ سامنے چوراہا تھا۔ دھرم تولا۔ ٹریفک سگنل کی بتّی سُرخ تھی مگر ان کی ٹیکسی سامنے آئی تو سبز ہوگئی۔ انھوں نے چوراہا عبور کیا، الیکٹرک سپلائی کے دفتر کو پیچھے چھوڑا اور سینٹرل ایونیو کی کُشادہ شاہراہ پر تیزی سے گزرنے لگے۔ اتوار کی وجہ سے ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ ہوا ارمان کے کانوں میں سیٹیاں بجا رہی تھی۔ وہ ہوا کی آواز صاف سُن سکتا تھا۔

"اور تیز! وہ پیچھے آ رہے ہیں!"

ارمان، ہارون کی طرف مُڑا اور پھر پیچھے دیکھا۔ روشنی کے دو نقطے، کسی گاڑی کی سامنے والی بتّیاں، ان سے نزدیک آتے جا رہے تھے اور بڑے ہوتے جا رہے تھے۔

"وہ ہمیں پکڑ لیں گے، ہارون بھیا!"

"نہیں، نہیں پکڑیں گے"

ہوا کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں روشنیاں اب سُکڑنے لگیں، اور بارش ٹیکسی کی کھڑکی پر برسنے لگی تو

دُھندلا گئیں۔اب ارمان مُڑکر سامنے دیکھنے لگا۔ایک کے بعد، روشنیوں کا سیلاب سامنے آتا اور کوئی نہ کوئی گاڑی زن سے گزر جاتی۔

سامنے روشنیاں تھیں۔دور روشنیاں۔گاڑی نہیں، یہ بس تھی۔دیو جیسی بس، جس کی آنکھوں کی جگہ روشنیاں تھیں، جو ہر لمحہ بڑی سے بڑی ہوتی جا رہی تھیں۔

اب یہ بس، ٹرک بن گئی تھی۔سڑک کے دونوں طرف کی عمارتیں غائب ہوگئیں۔روشنیاں اوجھل ہوگئیں۔اندھیرے کا راج تھا۔اندھیرا، اندھیرا، اندھیرا، بیپٹر، بیپٹر، بیپٹر---

"کیا ہُوا ارمان؛ ڈھئے کیوں جارہے ہو۔؟"

ہارون کا یہ سوال آوازوں کے سیلاب میں کھوگیا جو ارمان کے شعور میں اُمڈ رہا تھا۔اس ٹکراؤ کی زوردار آواز جس نے اُسے زمین پر گرادیا۔اور اس کے بعد کانوں میں بجتی ہوئی سیٹیاں۔پھر یادوں کا سیلاب اس کے اندر اُمڈنے لگا، یادیں، ہر اُس چیز کی یاد جو اس کی زندگی کے بارہ سال اور تین مہینے میں پیش آئی تھی۔یہ موجوں کی طرح اُبھرتی چلی آتی تھیں "ہم یہاں ہیں" یہ اُس سے کہہ رہی تھیں "جس یاد کو تمھارا جی چاہے لے لو، جب تم چاہو" انھی یادوں میں سے ایک نے اُسے بتایا کہ وہ نادر ہے۔یہ اس کا اصلی نام تھا۔اس کا پیار کا نام ببلو تھا۔اور اس کے ابّا کا نام احمد علی دانیال تھا۔اس کے تین بڑے بھائی تھے اور ایک بڑی بہن فرزانہ اور فرزانہ کی شادی ہوچکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں رہتی تھیں۔اس کی یادوں نے اُسے دادی کے بارے میں بتایا۔دادی اُوپر والے لمبے برآمدے کے سرے پر کمرے میں تھیں۔وہ جھُوم جھُوم کر دُعاؤں کا وِرد کیے جاتیں۔سُنہری فریم کی عینک اُن کی ناک پر سے پھسل رہی تھی---اور اس کا بھائی کہہ رہا تھا، "اب دیکھو! کلائی کس طرح مُڑتی ہے جب تم گیند پھینکتے ہو..." اور حساب کے ماسٹر، شکلاجی چیخ رہے تھے، 'بند کرو! بند کرو! من موہن' من موہن کا گول مٹول، شرارت بھرا چہرہ۔ہر مرتبہ وِکرم اپنی پنسل چھیل کر ڈیسک پر رکھتا تو من موہن اُسے زمین پر گرادیتا، کاغذ کی نلکی سے پھونک مار کر... اس کی بہن کی شادی میں بجنے والا گراموفون... سوئی رکارڈ پر اٹک گئی تھی، یہ بسم اللہ خان کی شہنائی کا گِھسا ہُوا رکارڈ تھا، اور وہی چمک دار آواز بار بار دُہرائے چلی جارہی تھی، یہاں تک کہ کھانے کی میزوں پر کھڑے ہوئے شادی کے مہمان قہقہے لگانے لگے... ہاں اور دارجلنگ۔اس سے پچھلے سال پوری۔دارجلنگ پھر سے کسی اور بیتے ہوئے وقت میں۔والٹیر کے ساحل پر کھڑے ہوئے، جب وہ چھوٹا سا تھا، اس کے پیروں کو چھوتا ہوا پانی، پیروں تلے سے بہتی ہوئی ریت جو اس کے تلووں کو گدگدا رہی تھی۔ریت چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی طرح تھی، گیلی، ٹھنڈی اور سرسراتی ہوئی "گر جاؤ گے۔ببلو" اس کی امّی پکار رہی تھیں اور اُسی لمحے وہ چھپاک سے گر پڑا تھا۔اُسے اپنی امّی پوری طرح سے یاد نہیں تھیں۔

اب وہ دیوار پر جڑی ہوئی تصویر تھیں۔ اب تین تصویریں تھیں اس بہت بڑے سارے گھر میں۔ اس کے چچا بھی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے، جب تک وہ ٹھیک تھے۔ ان کا دماغ چل گیا تھا۔ اب وہ لمبنی میں تھے۔۔۔

پھر وہی ٹیکسی۔ اب اس نے اس کی آواز سُنی اور اُس نے سڑک کی روشنیاں دیکھیں۔ ہارون؟ ہاں، یہ رہا ہارون، اپنی طرف سے کھڑکی کا شیشہ اوپر کر رہا تھا۔

"ڈر گئے ارمان؟" ہارون پوچھ رہا تھا۔ "اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں وہ ہمارے پیچھے نہیں ہیں"

ارمان کے کانوں میں السیشن کتے کے بھونکنے کی آواز گونج رہی تھی۔ یہ کتا ان کے پڑوسیوں کا تھا۔ اس کا نام ڈیوک تھا۔ وہ ڈیوک سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ بڑا بہادر لڑکا تھا۔ وہ اکیلا سوتا بھی تھا۔ اور وہ اکیلا ہی تھا ایک دن جب دارجلنگ میں دُھند چھا گئی تھی اور بُرچ ہل روڈ کی ہر چیز اس میں چھپ گئی تھی۔ وہ تب بھی نہیں ڈرا تھا۔

"کیا تمھاری طبیعت خراب ہو رہی ہے؟" ہارون نے پوچھا۔ "یا کسی بات پر پریشان ہو"

ارمان نے سر ہلا دیا۔

"پھر کیا بات ہے۔؟"

اس نے ہارون کی طرف دیکھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ٹیکسی چل رہی تھی۔ شیشہ بند تھا، اس لیے اس کی آواز صاف سُنائی دے سکتی تھی۔ چاہے وہ آہستہ سے بھی بولے۔

"سب کچھ واپس آگیا ہے، ہارون بھیا" اس نے دھیرے سے کہا۔ (باقی آئندہ)

امریکہ میں ہر روز

•۔ امریکہ میں ہر روز ایک لاکھ آٹھ ہزار افراد اپنے مکان تبدیل کرتے ہیں۔ اور اٹھارہ ہزار افراد ایک ریاست سے دوسری ریاست میں منتقل ہوتے ہیں۔

•۔ چالیس افراد روزانہ سو سال سے زائد عمر کے، پانچ ہزار آٹھ سو پینسٹھ سال سے زائد عمر کے اور آٹھ ہزار چالیس سال سے زائد عمر کے ہو جاتے ہیں۔

•۔ ایک ہزار ساٹھ افراد روزانہ دیوالیہ ہو جاتے ہیں۔ چھ سو نواسی نیا کاروبار شروع کرتے ہیں اور ایک سو پانچ افراد لکھ پتی بن جاتے ہیں۔

•۔ ہر روز پینتالیس ہزار نئی گاڑیاں اور ٹرک خریدے جاتے ہیں۔ اور ستاسی ہزار توڑے پھوڑے جاتے ہیں۔

عامر اعجاز ——— ڈنگہ (گجرات)

مہتاب ظفر

انگوٹھے کی فریاد

میں روزی کا انگوٹھا ہوں
اُس کے منہ میں رہتا ہوں
قیدی بن کر جیتا ہوں
پتلا ہوتا جاتا ہوں
کس شامت کا مارا ہوں
حلوہ ہوں، نہ پیرا مٹھا ہوں
میں روزی کا انگوٹھا ہوں

ظُلم یہ کیسا ڈھاتی ہے
مجُھ بیکس کو ستاتی ہے
جب بھی موقع پاتی ہے
مجُھ کو چوُسے جاتی ہے
سالن ہے نہ چپاتی ہے
میں ہی اِس کا کھانا ہوں
میں روزی کا انگوٹھا ہوں

میری عمُر ہوئی چھ سال
اور یہ میرا پتلا حال
مجھ پر اس کی رال ہی رال
سوکھ چلی ہے میری کھال
دیکھ مجھے اب منہ سے نکال
ورنہ تھانے جاتا ہوں
میں روزی کا انگوٹھا ہوں

PID (Islamabad)
manhattan International

دادا ابا کی اٹھارویں سالگرہ

محمد شاہد رفیع

"ارے یہ امجد کہاں ہے؟ بڑی دیر سے نظر نہیں آیا۔" امی نے سوئٹر بُنتے بُنتے چونک کر پوچھا۔

"بھائی جان تو آج اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ جب سے وہ وہیں ہیں۔" سعدیہ نے بتایا۔

"ہیں!.... اس کا مطلب ہے، وہ کئی گھنٹوں سے اپنے کمرے میں بند ہے۔ ذرا دیکھوں تو۔" یہ کہتی ہوئی وہ امجد کے کمرے کی طرف چلیں "کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی اس کی!" تشویش سے بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ اندر سے بند تھا۔

"امجد! امجد!" انہوں نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے آواز دی۔

"جی امی!" اندر سے امجد کی آواز آئی۔

"اندر کیا کر رہے ہو؟ یہ دروازہ کیوں بند کیا ہوا ہے؟"

"بس ابھی کھولتا ہوں امی!"

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟" امی کو تشویش ہوگئی۔

"جی امی! بالکل ٹھیک ہوں اللہ کا شکر ہے۔" یہ کہتے ہوئے امجد نے دروازہ کھول دیا۔

"ہیں یہ کیا؟ اس قدر پسینے میں شرابور ہو رہے ہو۔ کیا کر رہے تھے تم"؟ امّی بیک وقت حیرت اور پریشانی سے بولیں۔

"آپ اندر تو آئیے۔"

"ارے یہ کیا! یہ کمرہ کس خوشی میں سجایا گیا ہے۔؟" امّی نے کمرہ سجا ہوا دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔ امجد شرارت بھرے انداز میں مسکراتا رہا۔

"آج پھر کوئی انوکھا مذاق سوجھا ہوگا۔" امّی مسکرانے لگیں۔ امجد کو نت نئی شرارتیں کرنے میں مزا آتا تھا۔ امجد ہی کیا، یہ تو ہر بچّے کی فطرت ہوتی ہے۔ لیکن امجد کی شرارتیں اس کی ذہانت کی عکاس ہوتی تھیں۔ وہ ایسی شرارتیں نہیں کرتا تھا جس سے کسی کو تکلیف ہو۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اس کی شرارتوں اور مذاق میں بھی جھوٹ شامل نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے امّی ابّو یا دادا اُسے شرارتوں پر ڈانتے ڈپٹتے بھی نہیں تھے۔

"بس امّی! ......میں نے کچھ دوستوں کو آج شام گھر بلایا ہے۔" امجد نے کہا "تو میں نے سوچا، کمرے کی صفائی وغیرہ کر لوں۔"

"ہاں ہاں! اتنے بھولے ہو نا تم ..... کچھ نہ کچھ چکر ہے ضرور .... خیر .... پتا چل ہی جائے گا۔" امّی نے کہا۔ "تو کب آئیں گے تمہارے دوست؟ کتنے ہوں گے؟۔ گھر میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ چائے وغیرہ کا انتظام بھی کرنا ہے یا نہیں؟"

"مغرب کے بعد بلایا ہے۔ میں نے سوچا، کمرہ ٹھیک کر لوں پھر بتادوں گا۔" امجد نے کہا۔

"کچھ پتا بھی ہے۔ مغرب میں تو چند منٹ ہی رہ گئے ہیں" امّی نے بتایا۔

"اچھا! مجھے تو وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ میں پھر نماز پڑھ آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ مسجد چلا گیا۔

عدنان اور محمود تو باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے۔ وہ امجد کے ساتھ ہی مسجد سے آگئے۔ باقی دوست بھی ایک ایک کر کے آنا شروع ہو گئے تھے۔ امجد نے کل ہی سب کو بتایا تھا کہ کل میرے گھر سالگرہ کی دعوت ہے۔ تم سب کو آنا ہے۔ اسی لئے سب اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی تحفے کر آ رہے تھے۔ ابھی دو ایک دوستوں کا انتظار تھا۔ سب آپس میں چہک چہک کر باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں موٹا ببلو بھی آگیا۔ وہ ایک بڑا سا غبارہ لے کر آیا تھا۔ شبیر نے اسے دیکھ کر ہانک لگائی۔ "ارے یہ دو غبارے کہاں سے چلے آ رہے ہیں۔" اس بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔ ببلو بھی ہنستا ہوا ان کی محفل میں شریک ہو گیا۔

"بھئی امجد! عدنان نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ جیسے اچانک اسے کچھ یاد آگیا ہو۔" تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں! یہ کون سی سالگرہ ہے۔؟"

"ہاں یار، یہ تو معلوم ہی نہیں ہوا" شبیر بولا۔
"آج دراصل اٹھارویں سالگرہ ہے۔" امجد نے کہا۔
"اٹھارویں ؟" نعمان اور سیلو حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کورس کے انداز میں بولے۔
"بیوقوفو ! یہ مذاق کر رہا ہے، اتم لوگوں نے یقین بھی کر لیا" شبیر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔
"نہیں ، میں مذاق نہیں کر رہا۔ آج واقعی اٹھارویں سالگرہ ہے" امجد نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہم مان ہی نہیں سکتے" عدنان بولا۔ "ہم سب آپس میں ہم عمر ہیں اور تم زیادہ سے زیادہ بارہ سال کے ہوگے"۔
"ہاں اور بہت ہوئے تو تیرہ کے ہوگے۔ اس سے زیادہ کے ہو ہی نہیں سکتے"۔ محمود نے بھی عدنان کی تائید کی باقی سب کے سر بھی اثبات میں ہل رہے تھے۔

"ارے عقلمندو ! میں نے یہ کب کہا کہ یہ میری سالگرہ ہے" امجد نے وضاحت کی۔ سب ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گئے۔ "ہاں یار، یہ تو اس نے نہیں کہا کہ یہ اس کی سالگرہ ہے" نعمان نے کہا۔
"لیکن تمہارا تو کوئی بڑا بھائی یا بہن ہے نہیں" محمود نے کہا "پھر یہ کس کی سالگرہ ہے۔؟" سب کی متحیر نگاہیں امجد پر مرکوز تھیں۔ امجد ان کی حیرانی سے محظوظ ہونے کے لئے کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا "اچھا میں اپنے دادا کو بلا کر لاتا ہوں، وہ بتائیں گے کہ اصل بات کیا ہے۔؟"
امجد دوڑا دوڑا دادا کے پاس گیا۔ "دادا ابو ! دادا ابو میرے کچھ دوست آئے ہیں، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"
"ہیں، یہ کیا بات ہوئی ؟ دوست تمہارے ہیں، ملنا مجھ سے چاہتے ہیں۔ کچھ بات سمجھ میں نہیں آئی"
"ارے دادا ابا! آپ چلیے تو ! بات خود ہی سمجھ میں آ جائے گی" امجد، دادا کی کلائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ امجد جب انہیں اس طرح کھینچتا تھا تو دادا سمجھ جاتے تھے کہ اب یہ اپنی بات منوائے بغیر نہیں مانے گا لہٰذا وہ اس کے ساتھ چپ چاپ چل دیئے۔ دادا کو آتے دیکھ کر لڑکے خاموش ہو گئے اور ان کے آنے پر ادب سے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔ جیو خوش رہو۔ میرے بچو! بیٹھو بیٹھو"۔ دادا انہیں بیٹھنے کا کہتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئے۔ کچھ دیر وہ منتظر رہے کہ شاید لڑکے بات شروع کریں گے، لیکن انہیں خاموش پا کر وہ خود ہی بولے "ہاں تو برخوردارو ! کس لئے بلایا گیا ہے، مجھے "؟
لڑکے اب بھی خاموش تھے۔ شاید وہ ایک دوسرے کے بولنے کے منتظر تھے۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" دادا نے پھر پوچھا۔
"نہیں دادا جان! کوئی خاص بات تو نہیں یہ امجد خود ہی آپ کو بُلا کر لایا ہے"۔ عدنان نے کہا۔
"ہیں!... تم خود بلا کر لائے ہو اور کہہ رہے تھے کہ میرے دوست ملنا چاہتے ہیں۔ چکر کیا ہے۔ یہ سب؟" دادا نے حیران ہوتے ہوئے امجد سے پوچھا۔
امجد نے لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم لوگ پوچھ رہے تھے نا کہ یہ کس کی سالگرہ ہے۔؟"

"ہاں پوچھ تو رہے تھے۔" شبیر نے کہا۔ "لیکن دادا کو تو بُلانے کے لئے نہیں کہا تھا" اس پر امجد نے گانے کے انداز میں کہا۔ "آج میرے دادا کی سالگرہ ہے"۔
"کیا....؟" سب لڑکے حیرت کے مارے ایک ساتھ بول اُٹھے اور دادا تو کچھ بول ہی نہ پائے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سب آنکھیں پھاڑے امجد کو دیکھ رہے تھے۔
"بھئی کیا مذاق ہے یہ امجد؟ نہ تمہاری اٹھارویں سالگرہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی تمہارے دادا کی۔ یہ کیا چکر چلایا ہے.... تم نے؟" محمود بولا۔
"ہاں بھائی! اب سچ بات بتا ہی دو، ورنہ کہیں حیرت کے مارے ببلو پھٹ ہی نہ جائے" شبیر نے کہا سب ایک بار پھر ہنس پڑے۔ لیکن حیرانگی کے آثار ان کے چہروں پر بدستور قائم تھے۔
"میں نے کوئی بات جھوٹ یا غلط نہیں کی ہے۔" امجد اب بھی اپنی بات پر مُصر تھا۔
"تو تُو نے ان کو میری سالگرہ پر بلایا ہے۔ اور وہ بھی اٹھارویں"؟ دادا بات کو سمجھ کر امجد کو کان سے پکڑتے ہوئے بولے
"ہاں تو اور کیا دادا" امجد نے کہا "آج آپ کی اٹھارویں سالگرہ نہیں تو پھر کون سی ہے۔ اب آپ یاد نہ رکھیں تو آپ کا فرماں بردار پوتا تو آپ کی سالگرہ نہیں بھول سکتا۔ کبھی کبھی تو آپ کی سالگرہ آتی ہے۔"
اب دادا کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ انہوں نے لڑکوں کو سمجھانا شروع کیا۔ "بچو! امجد ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ آج میں بہتّر ۷۲ سال کا ہو گیا ہوں۔ لیکن تم لوگوں کو معلوم ہے کہ آج ۲۹ فروری ہے۔ میں آج سے بہتّر ۷۲ سال پہلے ۲۹ فروری کو پیدا ہوا تھا اور یہ تاریخ تو چار سال میں ایک دفعہ ہی آتی ہے۔ اس لحاظ سے آج میری واقعی اٹھارویں سالگرہ ہے۔ اس شریر نے خود ہی سوچ ساچ کر چپ چاپ ہی میری اٹھارویں سالگرہ کر ڈالی"۔
بچوں کی سمجھ میں بھی سارا معاملہ اب آیا اور دادا سمیت سب نے دل کھول کر قہقہہ ہی نہیں لگایا، امجد کی ذہانت اور شرارت کی داد بھی دی۔ پھر بچوں نے امجد کی آواز میں آواز ملا کر کہا۔
"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو دادا!"

علی مرتضیٰ

چشم سے چشم نمائی تک

ابھی کل کی بات ہے ۔ باجی مجھ سے کہنے لگیں "آج کل نہ جانے پڑوسیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ سب ہی وقت پر آنکھیں پھیرنے لگے ہیں"۔ پھر وہ مجھے آنکھیں دکھاتی ہوئی بولیں "کل سے خالہ جی تمھاری راہ تک رہی ہیں اور تم ہو کہ اپنا چہرہ تک اُنھیں نہیں دکھاتے۔"

میں فوراً لپک کر پڑوسن خالہ جی کے گھر پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی ایسا لگا جیسے خالہ میری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہیں۔ میں نے اُن کی خیریت دریافت کی تو لگیں آنسو بہانے ۔ روتے روتے انھوں نے آنکھیں سُجالیں۔ پھر مجھ سے بولیں "اب تو تم بھی طوطا چشم ہو گئے ہو۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں لہٰذا میں نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نگاہوں میں تولتے ہوئے بولیں "یاد رکھو جو کسی کی نگاہوں سے گر گیا وہ پھر کبھی اُس کی آنکھ کا تارا نہیں بن سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ پھر آبدیدہ ہو گئیں اور آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے بولیں "تمھاری آنکھیں تو اُس وقت کھُلیں گی، جب میری آنکھیں بند ہو جائیں گی۔" یہ سُن کر میری آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔

"اللہ نہ کرے خالہ جی۔" میں زار زار روتے ہوئے بولا اور اُن کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے آنکھ اُٹھا کر مجھے دیکھا اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگیں۔ پھر سنبھل کر انھوں نے مجھے اپنی سُرخ سُرخ آنکھوں سے گھورا اور بولیں "سُنا ہے، میری جائداد پر تمھاری نظریں جمی ہیں۔"

خالہ کا جُملہ جونہی مکمل ہوا، میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں غصّے میں آنکھیں نکال کر بولا "میری آنکھوں میں آپ کے لیے بہت مروّت ہے، لیکن آپ مجھے اس کا یہ صلہ دے رہی ہیں کہ مجھ سے آنکھیں بدل رہی ہیں۔ یاد کیجیے وہ دن، جب آپ اسپتال میں تھیں تو میں نے وہ راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ اور آپ اُس وقت کہتی تھیں کہ تم میری آنکھوں میں کھُب گئے ہو اور اب میں آپ کی آنکھوں کا خار بن گیا ہوں، لیکن آج آپ کی اس بات سے میری نظروں میں آپ کا مقام پہلے جیسا نہیں رہا۔ اور مجھے ایسا لگ رہا ہے، جیسے آج سے آپ میری آنکھوں سے دُور ہو گئی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ انھوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

Goldfish
Deluxe Pencil

حقیر
سی
لکیر

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم ، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈفِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E. MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PH.NE: 293451

جہاں چلے ، رواں چلے

BOND

آخری شرارت

عامر یونس

ماسٹر صاحب اردو کے ایک شعر کا مطلب سمجھا رہے تھے۔ پوری کلاس توجّہ سے سُن رہی تھی۔

"خواجہ میر تقی میر اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ..."

"اُف .... !" ماسٹر صاحب کے جملے کے درمیان کاشف کی بلبلاتی ہوئی آواز آئی۔

"کیا ہوا تمہیں ... " ماسٹر صاحب کاشف کو گھورتے ہوئے بولے۔

"سَر کسی نے یہ مارا ہے۔ ... " کاشف نے ایک مڑا ہوا گتّا ماسٹر صاحب کو دکھاتے ہوئے کہا

"مگر اس سے کس طرح مارا جا سکتا ہے ..."

"جناب ربر بینڈ میں رکھ کر زور سے مارا جاتا ہے ...."

"کس نے مارا ہے یہ .... " ماسٹر صاحب نے کلاس کی طرف دیکھا مگر سب چُپ چاپ بیٹھے رہے ..... "کوئی نہیں بتائے گا.... ٹھیک ہے ... اب میں بھی نہیں پڑھاؤں گا .... سب بچے خاموشی سے گھر کا کام کریں گے ....." ماسٹر صاحب نے کہا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ پھر پیریڈ ختم ہوا

اور وقفے کی گھنٹی بجی۔ تمام بچّے باہر دوڑ پڑے۔ خالد ایک جگہ بیٹھا اپنا لایا ہوا ناشتہ کھا رہا تھا کہ سامنے سے اظہر گزرا۔

"اظہر آج کلاس میں تم نے کاشف کو مارا تھا نا ....."؟

"تم کو کیا ہے۔ ..." اظہر نے روکھے منہ سے کہا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟ .... بلاوجہ پوری کلاس کو سزا ملی ..."

"سزا ..... ہاہاہا .... ارے تم لوگوں کو تو میرا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ ماسٹر صاحب کو چپ کروادیا ورنہ پتہ نہیں کب تک بولتے رہتے ....." اظہر ہنستے ہوئے بولا۔

"ارے ناصر، رضا! ذرا سنو تو، خالد کہہ رہا ہے کہ میں نے ماسٹر صاحب کو خاموش کرواکے تمام کلاس کو سزا دلوائی تھی ..." اظہر نے اپنے دوستوں سے کہا۔

"ہاہاہا ... سزا .... ارے وہ تو تحفہ تھا تحفہ" اظہر قہقہہ لگا کر بولا اور تینوں ہنستے ہوئے چلے گئے۔

وقفے کے بعد خالد کلاس میں داخل ہو رہا تھا کہ ناصر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"خالد! .... حساب کے سوال کرلئے ہیں نا تم نے۔ ..."؟

"ہاں ..." خالد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے دے دینا مجھے بھی مکمّل کرنے ہیں ..."

"نہیں ... اپنا کام خود گھر سے کرکے لایا کرو ..." خالد نے کہا اور اپنے بینچ پر بیٹھ گیا۔ ناصر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ رضا اور اظہر بھی ہنسنے لگے۔

"کیوں کیا ہوا؟ ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار میں کام کر رہے ہو ...." خالد نے پوچھا۔

"ذرا اٹھ کر اپنی پتلون تو دیکھو ..." ناصر نے ہنستے ہوئے کہا۔ خالد نے جلدی سے اپنی پتلون دیکھی

"ببل گم چپکی ہوئی ہے۔ ....." رضا نے کہا۔

"خالد کی "... ناصر نے جملہ آگے بڑھایا۔

"پینٹ پر ....." اظہر نے جملہ مکمّل کیا، اور تینوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ خالد بیچارہ ببل گم اُتارنے کی فکر کرنے لگا۔

"خالد بیٹے! تمہاری پتلون پر یہ دھبّہ کیسا ہے ..." گھر پہنچتے ہی خالد کی والدہ نے چیونگم کا دھبّہ دیکھ لیا تھا۔

"وہ امی جی ... آج پھر اظہر ناصر اور رضا نے چیونگم رکھ دی تھی. میری کرسی پر ...."
کتنی دفعہ شرارت کریں گے وہ. دو دفعہ پہلے کر چکے ہیں ... اور تم بیٹھ بھی گئے چیونگم پر ...."
"دراصل انہوں نے باتوں میں لگالیا تھا۔ ..."
"کیسا لڑکا ہے یہ اظہر اور اس کے دوست ناصر اور رضا .... کیا ان کو شرارتیں کرنے اور دوسروں کو ستانے کے علاوہ اور کوئی اور کام نہیں ہے..."؟
"پتہ نہیں .."
"اچھا چلو کپڑے بدلو. پتلون تو اب دھونی پڑے گی۔" خالد کپڑے تبدیل کرنے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

خالد اور اظہر کا مکان آمنے سامنے ہی تھا مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا. خالد خاموش طبع اور فرمانبردار تھا.. اظہر شرارت کا پتلا تھا. ہر وقت شرارتیں کرتا تھا اور دوسروں کو ستاتا رہتا تھا. اس کی شرارتوں سے اسکول کے سب ہی لڑکے تنگ تھے۔ چند دنوں سے وہ خالد کے پیچھے پڑ گیا تھا. کئی دفعہ چیونگم اس کے کپڑوں پر چپکا دیا کرتا .... کبھی سیاہی پھینک دیا کرتا تھا۔
دوسرے دن خالد واپس آیا تو اس کا منہ پھر اُترا ہوا تھا۔
"لگتا ہے آج پھر کچھ کیا ہے اظہر نے ..."؟
"جی امی جی ! .... اس نے آج حساب کی کاپی وقفے میں بغیر پوچھے نکال لی .... ماسٹر صاحب نے کاپی نہ دکھانے پر سزا دی۔" خالد منہ بسورتے ہوئے بولا۔
"اللہ تعالیٰ اظہر کو ہدایت دے. چلو بیٹا کھانا کھالو .... اور ہاں آج تمہیں ابو کے ساتھ بھی تو جانا ہے ..."
کھانے کے بعد خالد اپنے ابو کے ساتھ بازار چلا گیا، وعدے کے مطابق آج اس کے ابو کو اسے ایک بہت اچھا قلم خرید کر دینا تھا. قلم لے کر خالد خوشی خوشی گھر واپس آگیا۔ خالد کو یہ قلم خریدنے کی کتنی خواہش تھی. اور آج اس نے اپنی آرزو پوری کرلی تھی وہ خوشی خوشی نئے قلم سے ہوم ورک کرنے بیٹھ گیا۔

"خالد تمہیں حساب کی کاپی مل گئی تھی ....؟" کاشف نے پوچھا۔
"ہاں اظہر نے نکالی تھی. میں نے دوسرے دن گھر جاکر لے لی تھی ...." خالد نے جواب دیا. دونوں

کلاس کی طرف جارہے تھے۔ پہلے پیریڈ میں جب خالد نے اپنا قلم نکالا تو ساتھ بیٹھے ہوئے سب لڑکے اسے دیکھنے لگے مگر چونکہ کلاس ہورہی تھی اس لئے اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔ پیریڈ ختم ہونے کے بعد تو خالد کا نیا قلم مشہور ہوگیا۔

"دیکھو خالد کا نیا قلم کتنا اچھا ہے" سب ہی کہہ رہے تھے۔

ابھی کاشف قلم سے لکھ ہی دیکھ ہی رہا تھا کہ کوئی پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور کاشف اور خالد سے ٹکرا گیا دونوں گر پڑے۔ کاشف نیچے گرا اور اُوپر خالد دونوں جلدی سے اُٹھے۔ ایسے میں کاشف کو قلم کا خیال آیا اس نے نیچے دیکھا تو سکتے میں رہ گیا... اس کا نیا قلم دو ٹکڑے ہوکر زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے جُھک کر دونوں ٹکڑوں کو اُٹھا لیا اور اپنی بینچ پر بیٹھ گیا۔ پوری کلاس خاموش تھی۔ اظہر کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس کی ٹکر کی وجہ سے قلم ٹوٹا تھا۔ ماسٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو سارے بچّے خاموش ہوکر اپنی اپنی بینچوں پر بیٹھ گئے۔

"کیا بات ہے۔ پیریڈ پورا ہوگیا۔ آج تم لوگوں نے ذرا سی بھی آواز نہیں نکالی...." ماسٹر صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔ سب لڑکے خالد کی طرف دیکھنے لگے مگر وہ سر جھکائے خاموش رہا۔ ماسٹر صاحب باہر چلے گئے۔ پھر وقفہ بھی ہوگیا۔ لڑکے اس واقعے کو بھول گئے اور شور مچاتے ہوئے باہر بھاگے۔ مگر دو لڑکے ایسے تھے، جو کلاس میں ہی رہے۔ ایک خالد، دوسرا اظہر۔ اظہر کو خالد کا نیا قلم ٹوٹنے کا بہت افسوس ہورہا تھا۔ وہ صرف شرارت کررہا تھا مگر اس شرارت میں خالد کا قلم ہی ٹوٹ گیا۔ اظہر اپنے اندر بار بار معافی مانگنے کی ہمّت پیدا کررہا تھا مگر ہر بار جھجک جاتا.... اس نے آج تک کسی سے معافی نہیں مانگی تھی۔ یوں پورا دن گزر گیا اور چھٹّی ہوگئی۔

—•—

دوسرا دن شروع ہوا۔ اور بچّے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اسکول کی طرف بڑھنے لگے۔ اظہر آج نہیں آیا تھا۔

"کیوں خالد، تم نے اپنی امّی سے شکایت کردی تھی...؟" ایک لڑکا بولا۔

"پھر تمہاری امّی نے اظہر کی امّی کو بتایا ہوگا۔؟" دوسرے نے کہا۔

"اور مار پڑنے کی وجہ سے آج اظہر اسکول نہ آسکا۔ کیوں ٹھیک ہے؟"

نہیں بالکل غلط میں نے امّی سے شکایات ہی نہیں کی تھی صرف ان کو بتایا تھا اور میری امّی تو

ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ اللہ اظہر کو ہدایت دے ... وہ کبھی کسی کی شکایت نہیں کرتیں۔ میری امی بہت اچھی ہیں! خالد بولا۔

"تو پھر اظہر کیوں نہیں آیا ...؟" پوری کلاس حیران تھی۔

گھر پہنچ کر خالد نے اپنی امی کو بتایا کہ آج اظہر اسکول نہیں آیا تھا۔ "جاؤ بیٹا! اس کے گھر جاکر پوچھ آؤ ..." امی نے کہا۔

"کیا امی جی! اس کے گھر جاکر پوچھ آؤں۔ اظہر کے گھر ...؟" خالد حیرت سے بولا۔

"ہاں بیٹا..... ہو سکتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہو... پھر وہ نہ صرف تمہارا ہم جماعت ہے بلکہ پڑوسی بھی ہے۔ پڑوسیوں کا بہت حق ہوتا ہے بیٹا!"

"مگر امی جی وہ تو ہر وقت مجھے ..."

"تنگ کرتا ہے نا ... تو کیا ہوا۔ اچھا دیکھو، میں تمہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک واقعہ سناتی ہوں۔ جہاں سے حضور اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گزرتے تھے وہاں ایک بڑھیا رہتی تھی، حضور اکرمؐ کو تنگ کرنے کے لئے اس راستے پر کانٹے، پتھر اور کوڑا ڈال دیا کرتی تھی۔ حضور اکرمؐ ہمیشہ چپ چاپ وہاں سے گزر جاتے تھے ایک دفعہ یوں ہوا کہ حضور اکرمؐ اس جگہ سے گزرے تو وہاں کانٹے اور کوڑا نہیں تھا اور یہ معمول کے خلاف بات تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھ گئے کہ کوئی بات ہے انہوں نے آس پاس سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ اس بڑھیا کی طبیعت خراب ہے۔ حضور اکرمؐ فوراً اس بڑھیا سے ملنے گئے اور اس کی عیادت کی۔ بڑھیا اتنی متاثر ہوئی کہ فوراً اسلام لے آئی ..." امی نے تھوڑی دیر کے لئے سانس لی۔ پھر بولیں "جب ہمارے رسولؐ اپنے ساتھ زیادتی کرنے والوں کی مزاج پرسی کر سکتے ہیں تو پھر اظہر تو مسلمان ہے اور صرف شرارتی بچہ ہے۔ کیا تمہیں اس کو پوچھنے نہیں جانا چاہیے ...؟"

یہ واقعہ سن کر خالد کے دل پر بہت اثر ہوا تھا۔ "میں اظہر سے ملنے ضرور جاؤں گا......" خالد نے دھیرے سے کہا۔

"شاباش ...." امی خالد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"دیکھو بیٹے اظہر! تم سے کون ملنے آیا ہے ..." اظہر نے اپنی امی کی آواز سن کر کروٹ لیتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو حیران رہ گیا۔ سامنے خالد کھڑا تھا۔ جس کو وہ بہت تنگ کرتا تھا۔ اور اس کا نیا قلم بھی

اُس نے توڑ دیا تھا۔ خالد کہنیوں کے بَل اُٹھنے لگا۔

"ارے اظہر! آرام سے لیٹے رہو۔ اب کیسی طبیعت ہے ؟" خالد نے بہت ہی اچھے لہجے میں پوچھا۔ شرمندگی کے مارے اظہر بالکل چُپ تھا۔

"آج تم اسکول نہیں آئے تو میں سمجھ گیا کہ بیمار ہو گے۔ اس لئے پوچھنے چلا آیا۔" خالد نے کہا۔ اظہر خاموش رہا۔ اُسے اپنی حرکتیں یاد آ رہی تھیں۔ خاص طور پر قلم والی۔ پھر بیماری میں تو ویسے ہی انسان کا دل نرم ہو جاتا ہے۔ اظہر کے آنسو بہہ نکلے۔

"خالد! ..... تم ..... تم میری طبیعت پوچھنے آئے ہو"، اظہر رُک رُک کر بولا۔

"ہاں ہاں ... آخر تم میرے پڑوسی ہو اور ہم جماعت بھی۔"

"خالد .... خالد! مجھے معاف کر دو پلیز!" اظہر یکایک ہاتھ جوڑتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔

"ارے اظہر! ..... سنو ....." خالد نے بوکھلا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں تمہیں کتنا تنگ کرتا ہوں۔ پھر تمہارا نیا قلم بھی میں نے توڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود تم نے مجھے کچھ نہ کہا۔ بلکہ .. بلکہ بیماری میں ملنے بھی چلے آئے مجھے معاف کر دو خالد یہ میری آخری شرارت تھی ...."

"اچھا معاف کر دیا .... آخر تم میرے پڑوسی اور ہم جماعت ہو۔"

"اور دوست بھی ...."

"ہاں دوست بھی ...." خالد نے کہا اور دونوں مسکرانے لگے۔

بقیہ گنی چنی معلومات

- فورٹ ولیم کالج کے دور میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے خود بھی سولہ کتابیں تصنیف و تالیف کی تھیں۔
- ٹیپو سلطان سولہ برس میسور کے حکمران رہے۔
- اس وقت پاکستان میں سولہ ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ یہ اسٹیشن اسلام آباد، راولپنڈی، ملتان، پشاور، بہاولپور لاہور، کوئٹہ، کراچی، حیدرآباد، اسکردو، خضدار، گلگت، فیصل آباد، خیرپور، ڈیرہ اسماعیل خان اور تربت کے مقامات پر قائم ہیں۔

سعیدہ نازش

کایاپلٹ

پاگل ہے۔ پاگل ہے۔ گلی کے لڑکوں کی آواز پر خالد دوڑتا ہوا باہر نکل آیا۔

آؤ۔ خالد یار مزا آجائے گا آج تو۔ آؤ ہم بھی پتھر ماریں۔ شان نے چٹخارہ لے کر کہا نہیں ہرگز نہیں۔ رُک جاؤ مت مارو اسے۔ خالد دوسرے لڑکوں کے سامنے آگیا۔

ابے چل بے خود بھی پاگل ہو گیا ہے لڑکے اس کا مذاق اڑانے لگے۔

مت مارو مت مارو۔ میں نے اسے نہیں مارا تھا۔ مت مارو۔ وہ پاگل خود میں سمٹ رہا تھا۔

میں کہتا ہوں رُک جاؤ تم لوگ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔

واہ بڑا آیا حمایتی ایک لڑکا بولا۔

ٹھہرو تو بھائیو۔ پاگل یہ ہے مگر کسی کو کچھ نہیں کہتا البتہ ہم اسے مار کر خود پاگل ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔

اچھا تو پھر ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ۔ وہ لڑکا ہنس کر بولا۔

سنو تو سہی یہ پاگل کیوں ہوا میں بتاتا ہوں۔ میں اپنے ابو کے ساتھ مارکیٹ تک گیا تھا میں نے اسے وہاں دیکھا تھا اور بالکل تمہاری طرح اس کو چھیڑا تھا پھر میرے ابو نے مجھے اس کی کہانی سنائی تھی اور میں لرز کر رہ گیا تھا۔

وہ چپ ہو کر لڑکوں پر اپنی بات کا اثر دیکھنے لگا۔

لڑکے اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ہاں پھر کیا بتایا تھا انہوں نے وہ اس سے پوچھ رہے تھے

میرے ابو نے بتایا تھا کہ یہ شخص پہلے اچھے بھلے دماغ کا مالک تھا۔ یہ بھی اس وقت ایک لڑکا تھا۔

چونکہ اس کے ماں باپ نے اسے بڑے لاڈ پیار میں پالا تھا اس لئے اس کی شرارتوں پر کچھ نہ کہا جاتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ اس کی دوستی اپنی گلی کے بہت زیادہ شریر لڑکوں سے ہوگئی۔

ان لڑکوں کو ہر وقت ایک سے ایک نئی شرارت سوجھتی تھی اگر کوئی منع کرتا تو اس کے منہ کو آنے لگتے تھے جانوروں کو پریشان کرکے انہیں بہت مزا آتا کبھی کسی پرندے کو مارا کبھی اس کا گھونسلہ توڑ دیا کبھی بچے اٹھا لیئے کبھی پرندوں کے انڈے توڑ ڈالے۔

پرندے بے بسی سے چیختے چلاتے ادھر سے اُدھر اڑتے مگر یہ ان کی بے بسی سے مزہ اٹھاتے۔

کئی بار اس کی ماں جی نے بھی سمجھایا تھا کہ بیٹا پرندوں کو نہ ستایا کرو یہ بے چارے بے زبان جانور ہیں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتے ان کی فریادیں اللہ کے پاس جمع ہوتی ہیں۔

تو اماں میں کب جانوروں کو تنگ کرتا ہوں یہ تو گلی کے بچے ہوتے ہیں۔ وہ بڑا معصوم بن کر کہتا تھا۔ اور ہاتھ جیب میں پڑے غلّوں کو چھپایا کرتا۔

دن یونہی ان کی حرکتوں میں گذرنے لگے۔ میرے ابو کہتے ہیں کہ شرارت اور ایذا میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ شرارت وہ ہوتی ہے جو جس کے ساتھ کی جائے اسے بھی اس میں لطف آئے اور ایذا وہ ہے جو کسی کا دل دکھا کر لطف اٹھائے۔ تو پتہ ہے ایسی شرارت سے باز رہنا چاہیے۔ خالد نے کہا۔

یار اس کا بتاؤ نا۔ اسی لڑکے نے کہا۔

ہاں بھئی سنو تو بتا رہا ہوں وہ ہی بتائے جا رہا ہوں۔

پھر کیا ہوا کہ یہ لوگ اکثر مل کر بوڑھے لوگوں کا مذاق بنایا کرتے۔ کوئی اونچا سنتا تو چاچا بہرا اور بہرے بڈھے کے نام سے یاد کرتے۔

تو یار اسکے پاگل ہوجانے کا قصہ بتاؤ نا یہ ادھر اُدھر کی مت ہانکو۔ ایک لڑکا چڑ کر بولا یہ اِدھر اُدھر کی نہیں ہے میں اس لئے بتا رہا ہوں تاکہ ہم بھی اپنے اعمال ان کے آئینے میں دیکھ سکیں۔

اپنی اردو کا رعب مت جھاڑو۔ بات بتانا ہے تو بتاؤ ورنہ چھوڑ دو اس بات کو۔

ہاں تو بھائیو ایک دن کیا ہوا کہ ان کے محلے میں کہیں سے ایک پاگل شخص آنکلا۔ خالد ان کی باتوں پر ناراض ہوئے بغیر بولا۔

اس کے بدن پر چیتھڑے جھول رہے تھے وہ شاید بھوکا پیاسا بھی تھا۔ یوں بھی کسی پاگل کی بھوک پیاس کی پرواہ کون کرتا ہے۔

کہیں کچرے کے ڈھیر پر سے کچھ کھالیا تو ٹھیک لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے کہ دماغی ہسپتال پہنچادیں اس پاگل کو دیکھ کر ان لوگوں کی بن آئی۔

اب ایک نئی شرارت ان کے ہاتھ میں آ گئی۔

کوئی اسے چھو کر بھاگ رہا تھا کوئی دھکا دیتا۔ کوئی اس کے چیتھڑا کپڑوں کو مزید کھینچ کر چیتھڑا بنا دیتا۔

راہ چلتے افراد میں سے کسی نے انہیں ڈانٹا تو بھاگ گئے ذرا دیر بعد پھر واپس کر اسے ستانا شروع کر دیتے۔ پاگل کو ان سے بچاؤ کا راستہ نہ ملا تو اس نے بھی ان پر پتھر اٹھا اٹھا کر مارنا شروع کر دیئے وہ ان کے پیچھے چیخ بھی رہا تھا۔ اور کبھی خود کو بچانے کا راستہ بھی ڈھونڈتا مگر انہوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور پتھر بھی برسانا شروع کر دیے ایک پتھر اس کے سر میں بڑی زور سے لگا۔ خون بہنے لگا تو یہ سب لوگ بھاگ نکلے۔

وہ پاگل بھوکا پیاسا تو تھا ہی۔ خون بہنے سے مزید کمزور ہوا مگر پھر بھی وہ گرتا پڑتا وہاں سے نکل گیا۔

اس واقعے کے تیسرے دن اس کی لاش ایک اسٹیشن کے پاس ملی۔

وہ مر گیا مگر اس شخص کو احساسِ جرم نے آگھیرا۔ کاش ہم اسے نہ ستاتے اور اگر ستایا ہی تھا تو پتھر نہ مارتے پتھر مارا تھا تو اس کے زخم کی مرہم پٹی کر دیتے۔

اب اگر راستے میں کوئی پاگل شخص مل جاتا تو یہ خوف کھاتے اور یہ خوف خوابوں میں آنے لگا۔

سوتے میں اچانک چیخ مار کر اٹھ بیٹھنا ان کا معمول بن گیا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا تو وہ اعصاب پر دباؤ بتاتے۔ ان کا خوف پلتا رہا۔ احساسِ جرم تنگ کرتا رہا۔

اور اب یہ اکثر چیخ اٹھتے میں نے اسے نہیں مارا وہ تو خود ہی مر گیا تھا سب ہی تھے میں اکیلا تو نہیں تھا۔ یوں یہ شخص بیس سال پہلے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔

اور دوست آج ہم بھی اسے ماریں گے تو شاید کل کو ہم میں سے بھی کسی کا یہ ہی حال ہو۔ ہو سکتا ہے ہمیں اس کی بد دعا لگ جائے۔ اس لیے میرے دوستو میں آپ لوگوں کو منع کر رہا ہوں کہ اسے مت چھیڑو۔ مت تنگ کرو اسے۔

تم ٹھیک کہتے ہو دوست۔ یہ خطرناک پاگل نہیں ہے آؤ اسے صاف ستھرا کر کے کھانا کھلائیں۔ اس لڑکے نے کہا۔

ہاں ہاں سب بچوں نے ہاتھوں سے پتھر پھینکتے ہوئے جواب دیا۔ اور وہ سب اس کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھ گئے۔ اور خالد لڑکوں کی اس کایا پلٹ پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

انکل آئی کیو روبوٹ

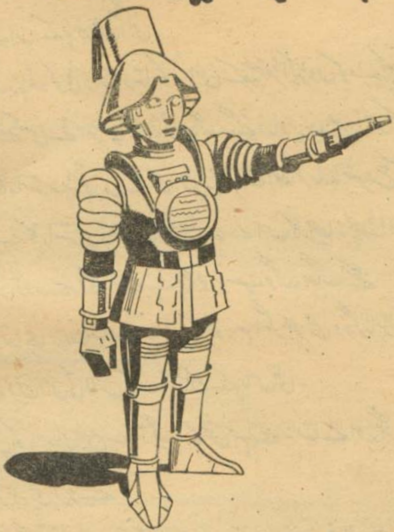

سوالاً جواباً

س : ایک انتہائی تیز رفتار جہاز سے پرندہ ٹکرا جاتا ہے تو جہاز کیوں تباہ ہوتا ہے؟ جبکہ پرندہ جہاز کے مقابلے پر بہت چھوٹا سا ہوتا ہے۔

(محمد اشتیاق، اصغر علی، غوثیہ پارک، لاہور)

ج : پرندے کے جہاز سے ٹکرانے کے عمل کو نیوٹن کے تیسرے قانون کے مطابق ردِعمل یا Reaction کہتے ہیں۔ یعنی جب سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے محوِ پرواز جہاز سے پرندہ ٹکرائے گا۔ تو جہاز سے پرندے کے ٹکرانے کا ردِعمل کئی گنا بڑھ جائے گا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب قسمت کا مارا پرندہ جہاز سے ٹکراتا ہے تو آناً فاناً وہ جہاز کے انجن میں داخل ہو کر انجن کے تیزی سے چلتے ہوئے بلیڈ سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ ریزے جہاز کے اندر پھنس کر اسے جام کر دیتے ہیں۔ اور بھئی ظاہر ہے کہ جب جہاز کا انجن بند ہو جائے گا تو جہاز کی تباہی اور ہلاکت بھی یقینی ہو جائے گی۔ عموماً اسی لئے ہر ملک کے ہوائی اڈّوں پر برڈ شوٹر مقرّر کئے جاتے ہیں جو فائر کر کے ہوائی اڈّوں کی حدود کو پرندوں سے محفوظ رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود کبھی کبھار ایسے خطرناک حادثے ہو ہی جاتے ہیں۔

● چاند پر کالے رنگ کے دھبے کس چیز کے ہوتے ہیں؟ (رابعہ راشد بشیر۔ بنوری ٹاؤن۔ کراچی)

دراصل یہ دھبے نہیں ہیں، بلکہ چاند کی سطح پر موجود بڑے بڑے گڑھے اور غار ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ دو لاکھ چالیس ہزار میل دُور سے یہ غار اور گڑھے محض دھبے نظر آئیں گے۔

● زمین گھومتی ہے تو ہمیں محسوس کیوں نہیں ہوتا؟ (چندافیانی حسین بلوچ۔ نوابشاہ

طارق رحیم۔ ناظم آباد۔ کراچی)

شکر کیجیے کہ ہمیں زمین کی گردش بالکل محسوس نہیں ہوتی ورنہ ہمیں اتنے چکّر آتے کہ توبہ ہی بھلی۔ اس لیے کہ زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کر رہی ہے۔ پھر زمین کا قطر بھی اتنا بڑا ہے کہ اس کی یہ تیز گردش محسوس نہیں ہو پاتی۔ البتّہ خلا سے زمین چمکتی ہوئی اور گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

کلوروفارم کیا ہے؟ اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیے؟

(ایم اکرم سیال حیدر۔ وکیل والا۔ ننکانہ صاحب) (نورین عتیق۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

یہ بے رنگ غیر آتش گیر اور بھاری مائع ہوتا ہے جو عموماً ڈاکٹر حضرات اپنے مریضوں کو بے ہوش کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کی خوشبو کچھ کچھ ایتھر سے ملتی جلتی ہے۔ کلوروفارم انتہائی تیز اثر ہے۔ اس کو سُو نگھنے سے بے ہوشی طاری ہونے لگتی ہے۔ اس کا حد سے زیادہ استعمال دل، دورانِ خون، جگر اور گُردوں پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ اسے ۱۸۳۱ء میں ایک امریکی کیمسٹ اور فزیشن سیموئیل گیوتھری (SAMUEL GUTHRIE) ایک فرانسیسی ماہر دواسازی۔ سوبیترن (E. SOUBEIRAN)۔ اور ایک جرمن کیمسٹ جسٹس وان لائبگ (JUSTUS VON LIEBIG) نے تیار کیا تھا۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک ڈاکٹر سر جیمز سمپسن نے اسے بے ہوش کرنے کے لیے ۱۸۴۷ء میں استعمال کیا۔ ۱۸۵۳ء تک اس کا استعمال عموماً طب کے مختلف شعبوں میں ہونے لگا تھا۔ اس کے علاوہ کلوروفارم مختلف ادویات میں بھی استعمال ہوتا ہے جن میں مرہم، درد سے آرام دلانے والی دوائیں وغیرہ شامل ہیں۔

● انکل مجھے عظیم تر کراچی کا صحیح اور مستند رقبہ معلوم کرنا ہے اور کچھ بنیادی معلومات اس شہر کے متعلق بھی۔ (ابنِ نظیر محمد بھٹی۔ لانڈھی۔ کراچی)

عظیم تر کراچی کا رقبہ جسے میٹروپولیٹن ایریا کہا جاتا ہے وہ ۵۶۰ مربع میل ہے۔ یہ انتہائی قدیم بستی تھی جہاں مچھیروں کی چند جھونپڑیاں ہوتی تھیں۔ اسے مختلف ادوار میں کلاچی، کلانچی اور کرّاچی

بھی کہا جاتا رہا ہے۔ اس کا موجودہ نام کراچی ہے۔ یہ پاکستان کا انتہائی اہم صنعتی شہر ہے۔ آبادی اسی لاکھ سے زائد ہے۔ یہاں دو بندرگاہ اور ایک بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ دو یونیورسٹیاں، تین میڈیکل کالج ایک انجینئرنگ کالج، درجنوں کالجز اور سینکڑوں اسکول بھی کراچی میں موجود ہیں۔

• ہمارے جسم میں کون کون سی دھاتیں پائی جاتی ہیں؟ (فرزانہ سمیع خان۔ گلبہار۔ کراچی)

ہمارے جسم میں یوں تو بہت سے اجزا پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر فاسفورس، کیلشیم، پوٹاشیم وغیرہ۔ مگر ان میں لفظ دھات کا اطلاق صرف آئرن یعنی فولاد پر ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق انسانی جسم میں اتنا فولاد ہوتا ہے جس سے چار بڑی کیلیں بنائی جا سکتی ہیں۔

• نوری سال سے کیا مراد ہے؟ (محمّد عامر۔ قصبہ کالونی۔ کراچی۔ شبانہ رحیم۔ سلطانہ رحیم ناظم آباد۔ کراچی)

آپ جانتے ہی ہوں گے کہ روشنی کی رفتار ایک کروڑ اسّی لاکھ میل فی سیکنڈ ہے۔ اب اسی رفتار سے روشنی اگر ایک سال تک متواتر سفر کرے تو جو فاصلہ طے ہوگا اُسے نوری سال کہا جائے گا۔ یعنی ہم اُسے مروجہ میلوں میں نہیں ناپ سکتے۔ کیونکہ ہمارے اعداد اور گنتی ختم ہو جائیں گے۔ اس کو درج ذیل مساوات سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے

ایک نوری سال = 5.88×10^{12} میل

• مسلمان سائنس دانوں نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ کچھ اس کے متعلق بتائیے۔

(محمد راشد قریشی۔ ملیر۔ کراچی)

مسلمان سائنس دانوں کے متعلق ان محدود صفحات میں سب کچھ بتانا ناممکن ہے۔ البتّٰہ اتنا سمجھ لیں کہ آج دُنیا میں جتنی ترقّی آپ کو نظر آ رہی ہے اس میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ ابو سینا، الفارابی، جابر بن حیّان، زکریا رازی، عمر خیام، ابن رُشد، الخوارزمی اور بہت سے دوسرے سائنسدانوں نے طب، جراحت، فلسفہ، جغرافیہ، فلکیات، منطق، زراعت اور دیگر علوم پر بیش بہا کتابیں لکھیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مامون الرشید نے ایک علمی ادارہ "بیت الحکمت" کے نام سے قائم کیا تھا جہاں بہت سے علماً سائنس مختلف تجربات میں مصروف رہتے تھے۔ اسی زمانے میں زمین کا قطر اور مختلف سیاروں اور چاند کے بارے میں جو معلومات اکٹھی کی گئیں انھیں جدید سائنس نے کافی حد تک درست مانا ہے۔

دائرۂ معلومات

اعلان دائرہ معلومات کے سلسلے میں ہمارے اکثر ساتھیوں کو یہ شکایت ہے کہ یہ بہت مشکل ہے اور سمجھ میں نہیں آتا. شاید اسی وجہ سے ساتھیوں نے اس میں دلچسپی لینا بھی کم کر دی ہے. لہٰذا آنکھ مچولی نے فیصلہ کیا ہے کہ دائرہ معلومات کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ اس کی جگہ ہم نئے نئے اور مختلف نوعیت کے انعامی سلسلے شروع کریں گے۔ اس بار ہم اپریل ۸۸ء کے دائرہ معلومات کا درست حل اور شرکائے مقابلہ کے نام دے رہے ہیں. اگلے شمارے میں مئی ۸۸ء کا درست حل اور شرکائے مقابلہ کے نام شائع کئے جائیں گے. یوں دائرہ معلومات اپنے اختتام کو پہنچے گا. اگر آپ کے ذہن میں کسی اور انعامی سلسلے کی کوئی تجویز ہو تو ہمیں ضرور ارسال کریں۔

دائرہ معلومات اپریل ۱۹۸۸ء (قہقہہ نمبر) کا درست حل

(۱) منشی سجاد حسین (۲) شوکت تھانوی (۳) ابنِ انشار (۴) رونی (۵) سید محمد جعفری
(۶) رفیع خاور (۷) چراغ تلے (۸) دلاور فگار (۹) حسینہ معین (۱۰) چارلی چپلن
(۱۱) عظیم بیگ چغتائی (۱۲) پطرس بخاری (۱۳) عطاء الحق قاسمی (۱۴) جاوید اقبال
(۱۵) مجید لاہوری (۱۶) بسلامت روی (۱۷) امتیاز علی تاج (۱۸) ۱۹۲۱ء (۱۹) خواجہ بدیع الزماں
(۲۰) علامہ اقبال

اپریل ۸۸ء کے انعام یافتگان

"قہقہہ نمبر" میں جو سوالات دیے گئے تھے، ان میں شاید نمبر شمار کی غلطی سے ساتھی کچھ زیادہ ہی اُلجھ گئے، اس وجہ سے کوئی بھی ساتھی درست حل نہیں بھیج سکا. صرف پانچ ساتھی ایسے تھے جنھوں نے ایک غلطی کی تھی، لہٰذا ان پانچوں ساتھیوں کو انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا. ان کے نام یہ ہیں.

- قرۃ العین تارڑ ____ گلبرگ ۳، لاہور
- رشید احمد صدیقی ____ اورنگی ٹاؤن، کراچی
- سید اسد معروف دوست ____ پشاور
- مقصود احمد صدیقی ____ اورنگی ٹاؤن، کراچی
- تصویر زہرہ ____ لیاقت روڈ، راولپنڈی

نئی تحریریں

آنکھوں دیکھا حال

سمیع الدین ـــ راولپنڈی

"ناظرین.... وعلیکم السّلام!

یہاں اب سے کچھ دیر بعد کرکٹ کا میچ شروع ہونے والا ہے جو ہم آپ کی خدمت میں براہِ راست لکھ ڑہے ہیں، ارے، آپ ہمارے "ڑ" لکھنے سے اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں۔ یہاں تو آج کل سب کو یہی دورہ پڑا ہوا ہے۔

ہاں تو میچ شروع ہونے والا ہے، اور بچے یہ میچ دیکھنے کے لئے اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہیں۔ وسیم صاحب بطور ماہر کھڑے ہیں کھلاڑی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ کاشف اور مانی میں لڑائی ہو رہی ہے۔ دونوں عمران اور عبدالقادر بننے پر لڑ رہے ہیں۔ وسیم صاحب! آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

"جی میرا خیال ہے کہ مانی کو قادر بننا چاہیے کیونکہ اس کی کمر میں بڑی لچک ہے۔ ابھی پچھلے دنوں آپ نے دیکھا ہو گا کہ بھائی کی شادی میں کیا زبردست ناچ رہا تھا۔ کاشف کو عمران بننا چاہیئے کیونکہ اس کے بال کافی بڑے ہیں۔"

اور ناظرین! شاہد نے بلّا سنبھالا اور کاشف دوڑتے ہوئے بولنگ کرانے آرہے ہیں۔ ارے یہ کیا کاشف صاحب کے ابو آگئے۔ انہوں نے کاشف کو کان سے پکڑا اور گھر کی طرف لے گئے۔ خیر، اب ان کی جگہ مانی بولنگ کرائیں

گے۔ انہوں نے اپنی کمر کو لہرایا اور چلتے ہوئے گیند جو کرائی تو شاہد نے بڑے آرام سے کھیلا۔ مانی نے دوبارہ بال کرانے کے لئے گیند پھینکی۔ اب کے شاہد نے بڑے جوش سے یہ بال کھیلی بال ہوا میں اُڑتی ہوئی سامنے والوں کی کھڑکی سے ٹکرائی اور زور دار دھماکہ ہوا۔ وسیم صاحب! آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جی دھماکے کے بارے میں؟"

"ارے نہیں وسیم صاحب! میرا مطلب ہے کہ اس چھکے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"دیکھیں، چھکا تو زبردست تھا..."

"ارے وسیم صاحب! یہ بچے کہاں گئے؟ اور لڑائی کی آواز ارے، وسیم صاحب بھی غائب ہیں۔ اس کا مطلب ہے ہمیں بھی اب چھت سے نیچے آجانا چاہیے!"

ہاں تو ناظرین! یہ میچ بھی بغیر کسی فیصلے کے ختم ہوگیا۔ اچھا اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

نعت ﷺ

ہوں مصیبت میں، تیز دھارا ہے
زندگی آج بے سہارا ہے

اپنی قسمت میں خاکِ طیبہ کہاں
اُن کی یادوں کا بس سہارا ہے

جس جگہ ذکرِ پاک ﷺ ہوتا ہے
اُس جگہ نور کا نظارہ ہے

آپ ﷺ کے کس عمل کی بات کروں
آپ ﷺ کا ہر عمل ہی پیارا ہے

عظمیٰ ناز روشن

ناکام آپریشن

محمد انجم مبین ـــــ ڈیرہ اسماعیل خان

مابدولت کلاس میں براجمان تھے۔ اور ٹیچر کے لیکچر کو ہمہ تن گوش ایسے سُن رہے تھے، گویا یہی بات، بالکل اسی طرح بی بی سی لندن کے گوش گزار کرنی ہو۔ یہ اور بات کہ ہمارے پلے خاک بھی نہیں پڑ رہا تھا، لیکن ٹیچر کی آخری بات جو ہمارے

دِل پر نقش ہو کر رہ گئی، وہ یہ تھی کہ آپ لوگ بھی مینڈک کا آپریشن کرنے کی کوشش ضرور کریں۔

اب تو ہم چھٹی کا شدّت سے انتظار فرمانے لگے۔ تاکہ جلد از جلد گھر پہنچ کر مینڈک کو اُوپر پہنچا سکیں، ساتھیو! آپ اُوپر پہنچانے کا مطلب تو ضرور سمجھتے ہوں گے۔ خیر جناب چھٹی ہو ہی گئی اور اس دن سب سے پہلے اسکول سے باہر نکلنے کا شرف ہم نے حاصل کیا۔ اور تقریباً اُڑنے کے انداز میں گھر کی جانب دوڑ پڑے، گھر پہنچ کر ہم نے بستے سے اپنے آپ کو الگ کیا اور غسل خانے کا رُخ کیا۔ کیوں کہ مینڈکوں کا اڈّہ وہی ہے۔ بد قسمتی سے اس وقت غسلخانے میں صرف دو مینڈک تھے۔ اور ان میں سے بھی ایک ہمیں دیکھتے ہی نالی کے راستے فرار ہو گیا۔ شاید ہمیں دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ اب ہم دوسرے مینڈک کی طرف بڑھے ہمیں مینڈک کی آنکھوں میں موت کے سائے منڈلاتے نظر آئے۔ ہم نے جیسے ہی مینڈک کو پکڑنے کی کوشش کی یعنی جھپٹا مارا، تو مینڈک صاحب سنگ آرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری ٹانگوں کے درمیان سے نکل گئے اور ہمارا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ دیوار تو صحیح سلامت رہی، البتہ ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، لیکن جلد ہی ہم نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور پھر مینڈک کی طرف متوجہ ہوئے لیکن مینڈک کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ ہم نے اپنی عقابی نظریں مینڈک کی تلاش میں دوڑائیں اور آخر کار ہماری آنکھوں میں لگی ایکسرے مشین نے اُسے تلاش کر ہی لیا۔ وہ صابن دانی کے پیچھے بڑے مطمئن انداز میں چھپا بیٹھا تھا۔ غالباً اُس کے ذہن میں یہ بات ہو کہ وہ ہمیں مکمل دھوکہ دے چکا ہے۔

مینڈک کو خوابِ غفلت میں دیکھ کر ہم دبے پاؤں اُس کی طرف بڑھے، ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ چونک کر صابن دانی کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ شاید اُسے ٹیپو سلطان کا یہ قول یاد آ گیا تھا کہ "گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے۔۔۔۔!" لیکن جناب ہم بھی اُس کی طرف یہ سوچ کر بڑھے کہ "دیر آید درست آید" اب مینڈک آہستہ آہستہ پھدکتا ہُوا نالی کی طرف بڑھا اور ہم چاہتے ہوئے بھی اُسے نہ روک سکے۔ نالی کے بالکل قریب پہنچ کر وہ رُک گیا، شاید وہ ہماری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ہم بھی تیر کی طرح اُس کی طرف بڑھے اور ایک دفعہ پھر بجلی کی سی تیزی سے اُسے پکڑنے کے لیے جھپٹا مارا، لیکن ہائے، اب تو ہمارا ہاتھ اس زور سے زمین سے ٹکرایا کہ بے اختیار ہماری چیخ نکل گئی، لیکن افسوس ہم اب بھی مینڈک کو نہ پکڑ سکے البتہ مینڈک غسل خانے کی نالی کے راستے باہر نکل کر ہماری چیخ سے ضرور محظوظ ہُوا ہو گا۔ ہم مینڈک کو صلوٰتیں سُناتے اور اپنے ہاتھ کو سہلاتے باتھ روم سے باہر نکل آئے۔

تکیہ کلام

پرنس حامد علی شاہد، لاوہ چکوال

اسلم صاحب کی سب سے بُری عادت ان کا تکیہ کلام تھا۔ کیونکہ جب بھی کوئی بات کہنی ہوتی، تو آخر میں لفظ "بتری" ضرور کہتے۔ اور اس وجہ سے انہیں کئی بار سزا بھی ملی مگر اسلم صاحب کی یہ عادت نہ گئی۔ اور بتری کا دُم چھلا ان کے ساتھ لگا رہا۔ اسلم صاحب کے گھر کچھ مہمانوں کو آنا تھا۔ اور مہمان تھے ان کے چچا، جو کراچی سے بڑی مدّت کے بعد آ رہے تھے اس لئے صبح ہی سے گھر میں گہما گہمی کے آثار تھے۔

"اسلم بیٹے! بھائی جان سے کہو، جلدی کریں مہمان آنے ہی والے ہوں گے"۔ امّی نے کچن سے آواز لگائی۔ اسلم صاحب منہ بسورتے ہوئے اُٹھے اور بھائی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے البتہ رفتار کسی تیز گھوڑے سے کم نہ تھی۔ پھر ظاہر ہے، انہیں راستے میں پڑا ہوا بڑا سا استقبالیہ پتھر کیسے نظر آ سکتا تھا۔ چنانچہ اگلے ہی لمحے بھاگتے ہوئے اسلم صاحب دھڑام کی آواز کے ساتھ زمین بوس ہو گئے پھر فوراً ہی طیش سے اٹھے اور ایک عدد بھرپور لات پتھر کو رسید کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلم صاحب اپنی لات پکڑ کر ڈانس کرنے لگے۔ اچانک انہیں امّی جان کا حکم یاد آ گیا۔ اس لئے ڈانس بھول کر تیزی سے بھائی جان کے کمرے کی طرف بڑھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر ان کے حلق سے آواز نکلی "امّی کہہ رہی ہیں کہ مہمان آنے ہی والے ہوں گے، اس لئے جلدی کریں۔ بتری"۔

"آ رہا ہوں"، بھائی جان نے گرج کر کہا۔ اور اسلم صاحب واپس مڑ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگے مگر دروازے کی طرف بڑھنے کی بجائے دیوار سے جا ٹکرائے اور دھڑام سے زمین پر جا گرے ان کے منہ سے معمار کے لئے ایک صلوات نکل گئی کہ اس نے غلط جگہ دروازہ لگایا ہے۔ اسی لمحے کال بیل کی شوخ آواز نے انہیں چونکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی بھائی جان کے کمرے سے آواز گونجی "ابے بتری کے بچے! دروازہ کھولو، مہمان آ گئے ہوں گے"۔

"اچھا بتری"۔ اسلم صاحب بادلِ نخواستہ اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھلنے پر ایک بزرگ شکل صاحب نظر آئے۔ جنہیں اسلم صاحب نے فوراً پہچان لیا۔

"آیئے چچا بتری!" اسلم صاحب نے ایک طرف ہٹتے ہوئے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ مہمان نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "کہاں ہے بجری،

مجھے تو کہیں نظر نہیں آتی۔"

اسلم صاحب نے حیرانی سے کہا "میں نے تو آپ کو اندر آنے کے لئے کہا تھا۔"

"تو کیا میں آپ کو بکری نظر آتا ہوں؟" مہمان کچھ غصّے سے بولا۔

"ارے ....ارے میرا مطلب بالکل نہیں اور میں نے آپ کو بکری کب کہا، چچا بتری" اسلم صاحب بوکھلا گئے۔ مہمان نے پھر چونک کر کہا "بھئی میں کرم دین ہوں .... بکری نہیں۔" "ارے چچا بتری، میں آپ کو جانتا ہوں" اسلم صاحب نے بڑے فخر سے کہا۔

"اوہو۔ مجھے کرم دین کہتے ہیں۔" مہمان کو تاؤ آگیا۔

"کون کہتا ہے"۔ اسلم صاحب نے اُلوؤں کی طرح آنکھیں جھپکائیں۔

"میرا مطلب تھا کہ ... میرا نام کرم دین ہے اور ..... اور تم مجھے چچا کرم دین کہہ سکتے ہو، بڑے بیوقوف ہو"۔ مہمان غصّے سے دھاڑا۔

"میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں، خیر چچا بتری اندر آئیے" اسلم صاحب خوشامدانہ لہجے میں بولے۔

"بھئی میں کرم دین ہوں، بکری نہیں" چچا چلّایا اسی لمحے بھائی جان بھی آگئے۔ انہوں نے اسلم صاحب کو ڈانٹ پلائی اور چچا کو لے کر اندر چلے گئے۔ اسلم صاحب نے غصّے سے دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگے مگر پھر بھائی جان کی آواز سن کر مجبوراً ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ بھائی جان نے حکم صادر فرمایا کہ چچا کے ساتھ گپ شپ لگاؤ میں ابھی آتا ہوں۔

اسلم صاحب وہیں بیٹھ گئے۔

"تمہارے گھر میں کتنے کمرے ہیں؟" چچا نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس چھ کمرے ہیں۔ چچا بتری" اسلم صاحب بولے۔

"پھر وہی بکری، میں چچا بکری نہیں، چچا کرم دین ہوں" چچا کرم دین کو تاؤ آگیا۔

"گھر کتنا بڑا ہے"؟ چچا کرم دین نے پھر سوال کیا۔

"بس اتنا ہی ہے۔ چچا بتری" اسلم صاحب بتری کہنے سے باز نہ آئے۔ چچا نے اس کی طرف دیکھا اور چلّایا۔ "پھر وہی تمہاری منحوس بکری" اسلم صاحب جھینپ گئے اور شرمندہ ہو کر بولے "اوہ سس سوری چچا بتری .... اوہ .... مم" چچا نے پھر گھور کر اسلم صاحب کی طرف دیکھا اور چلّائے "پھر بکری!"

اسی لمحے بھائی جان بھی آگئے انہوں نے اسلم صاحب کو ڈانٹ پلائی اور کمرے سے نکال دیا۔

اسلم صاحب مجرموں کی طرح سر جھکائے باہر نکل آئے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے اب وہ بیچارے کیا جانیں کہ اُن کے تکیہ کلام "بتری" کو چچا بکری سمجھ رہے تھے۔

اپنی حفاظت

ناصر بشیر ـــــ چوآسیدن شاہ

ملا نصر الدین اپنے گدھے پر سوار بازار سے گزر رہے تھے، ان کے پاس ایک بکری بھی تھی جس کے گلے میں گھنٹی بندھی تھی۔ انہوں نے احتیاط کے طور پر بکری کی دُم گدھے کی دُم سے باندھ رکھی تھی۔

راستے میں مُلا کو تین چور ملے جنہوں نے ملاّ کو لوٹنے کی ٹھان لی۔ پہلے نے کہا "میں بکری لے جاؤں گا۔" دوسرے نے کہا "میں گدھے کو لے جاؤں گا۔" تیسرے نے ملاّ کی پوشاک پر ہاتھ صاف کرنے کی ٹھانی۔

پہلے چور نے بکری کی رسّی کاٹ کر گھنٹی کو گدھے کی دُم سے باندھ دیا۔ دوسرا چور ملاّ سے کہنے لگا "گھنٹی ہمیشہ گدھے کی دم میں ڈالی جاتی ہے، گدھے کی دم سے نہیں باندھی جاتی آپ نے گدھے کی دم سے باندھ رکھی ہے۔ یہ کیا حماقت ہے"۔ ملاّ نے نظر اٹھا کر گدھے کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ بکری غائب ہے ملاّ کو بہت صدمہ ہوا اور وہ زور زور سے رونے لگے چور نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "چور ابھی ابھی اس راستے سے بکری لے کر گیا ہے۔ اگر اس کا تعاقب کیا جائے تو بکری مل سکتی ہے"۔ یہ سن کر ملاّ نے چور سے کہا "اگر آپ میرے گدھے کا دھیان کریں تو میں بکری ڈھونڈ سکتا ہوں"۔

ملاّ بکری کی تلاش میں ایک کوچے میں گھس گئے مگر بکری نہ ملنا تھی نہ ملی۔ ناچار ملاّ اسی جگہ واپس آ گئے۔ لیکن گدھے کی حفاظت کرنے والا کافی دیر پہلے گدھے کو لے کر بھاگ چکا تھا ملاّ نے اب بکری کے بجائے گدھے کی تلاش شروع کی لیکن وہ بھی انہیں نہ مل سکا۔

ملاّ غم و غصّے کی حالت میں گھر کو روانہ ہوئے راستے میں انہوں نے ایک آدمی کو کنویں کی منڈیر پر بیٹھے زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔ ملاّ نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں اس سے رونے کی وجہ پوچھی۔ اس شخص نے کہا کہ حاکمِ شہر کی بیوی کا زیور اور سونے کی ایک صندوقچی میرے پاس تھی میں یہ سامان حاکم کے گھر لے جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک آدمی آیا اس نے میرے سر پر ڈنڈا مارا اور میرے ہاتھ سے صندوقچی لے کر کنویں میں پھینک دی۔ اگر آپ صندوقچی نکال دیں تو سو دینار انعام

دوں گا۔"

ملّا نے دل میں حساب لگایا کہ اگر صندوقچی مل جائے تو کم از کم گدھے اور بکری کا نقصان پورا ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر ملّا نے کپڑے اُتارے اور کنویں میں اُتر گئے۔ بہت تلاش کی مگر صندوقچی کا کوئی نشان نہ ملا۔ مُلّا نے بہت آوازیں دیں مگر منڈیر پر کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ بڑی مشکل سے مُلّا باہر آئے اور اپنے لباس کو نہ پا کر سخت پریشان ہوئے۔ اب انہوں نے ایک لکڑی ہاتھ میں لی۔ اور اسے گھماتے ہوئے راستہ طے کرنے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ ملّا نے جواب دیا "اب صرف میں چوری ہونے سے بچ گیا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی مجھے بھی چوری کر کے نہ لے جائے چنانچہ اپنی حفاظت کی غرض سے ایسا کر رہا ہوں"۔

اُف! یہ ٹیلی فون

فرحت العین ـــــــ سیالکوٹ

پچھلے مہینے ہی کی بات ہے کہ ہمارے گھر ٹیلی فون لگا۔ فون کا لگنا تھا، گھر بھر میں لڑائی ہو گئی کہ کون پہلے اپنی دوست کو فون کرے گا اور خوشخبری سنائے گا کہ ہمارے گھر فون لگ گیا ہے۔ ابھی یہ لڑائی جاری ہی تھی کہ امّی فون نمبروں کی ڈائری لے آئیں۔ اور سب کو پیچھے ہٹا کر خالہ کا نمبر گھمانے لگیں۔ کوئی آدھ گھنٹہ بات کی، پھر چچی، ممانی، پھوپھی، سب ہی کو فون کر ڈالے۔ لیکن ہوا یہ کہ فون کرتیں کسی کو تو ملتا کسی اور سے۔ ہم سب گھٹنے جوڑے اُن کے

اِرد گِرد بیٹھے رہے۔ کوئی دو گھنٹے کی مشقت کے بعد فون بند ہوا تو آنٹی فرینہ جو کہ ہماری ہمسائی ہیں، ہاتھ میں پسینے سے بھرا، میلا کچیلا چھوٹا سا کاغذ لیے آئیں۔ منہ میں پان تھا عینک اُوپر کرتے ہوئے اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولیں۔

"مجھے ذرا لاہور کی کال ملانی ہے۔ میرا فون خراب ہے۔" ہم نے غصّے سے ہاتھ ملنا شروع کر دیے کہ اتنے میں امّی بولیں۔

"کیوں نہیں، آپ کا اپنا تو گھر ہے آپ جب مرضی آئے، شوق سے آئیے۔"

اتنے میں آنٹی فرینہ ہم سے مخاطب ہوئیں "ارے میری جان فری، ذرا یہ نمبر تو ملا دے۔" ہم نے کوڈ نمبر پوچھا تو بولیں "ارے دیکھ لے، یہیں لکھا ہوگا۔"

ہم جھنجلا گئے اور ناک چڑھاتے ہوئے بولے "یہاں نہیں لکھا۔"

اتنے میں امّی بولیں "ون سیون" سے پتا کر لو۔"

آنٹی بولیں "ارے نہیں، بہن! سیون اَپ تو

یں بیبیوں گی نہیں پہلے ہی بڑا زکام لگا ہُوا ہے "۔
امّی ہنستے ہوئے بولیں "بھئی میں تو نمبر بتا رہی تھی ۔ ۔ ۔"
"اچھا، اچھا" آنٹی نے سر ہلایا اور ہم لگے ون سیون کو ملانے ۔ کوئی پندرہ منٹ بعد انہوں نے فون اُٹھایا اور بڑی منت سماجت کے بعد نمبر بتایا ۔ اب لگے ہم انگلی گھسیٹنے کہ نمبر ملے ۔ کوئی آدھ گھنٹے کی مشقت کے بعد نمبر ملا جو کبھی انگیج جا رہا تھا، تو کبھی کوئی اُٹھا نہ رہا تھا اور جب نمبر ملا تو آنٹی مسلسل دس منٹ تک باتیں کرتی رہیں اس کے بعد ہم سب نے باری باری فون کیا ۔
اگلے دن ہم صبح پڑھ رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی ۔ لپک کر فون اُٹھایا تو دوسری طرف سے کوئی بچّہ تنگ کر رہا تھا کہ داداجان کو بُلا دیجئے ہم نے اُسے بڑا کوسا مگر وہ بڑا شریر تھا ۔ لاکھ سمجھانے پر بھی فون بند نہ کرتا تھا آخر غصّے کے عالم میں ہم پڑھنے بیٹھ گئے ۔ دس منٹ تک گھنٹی نہ بجی ۔ ابھی ہم نے شکر ادا کیا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی ہم سمجھے کہ اس بچّے کا فون ہے ۔ ریسیور اُٹھایا اور بغیر پوچھے اُسے بُری طرح جھڑک دیا ۔ لیکن پتہ چلا کہ دوسری طرف سے ماموں بول رہے ہیں کہ فرمی بیٹے اپنی امّی کو بلا دو ۔
"ارے یہ تو ماموں ہیں" ہم چیخے، پھر اُن سے بڑی معذرت کی اور بتایا کہ اصل قصّہ کیا تھا ۔
جی ہاں ! اگلے مہینے جب بل آیا تو پورے نوسو پینتیس روپے پچیس پیسے درج تھے ۔ پھر جو ابو سے ہمیں ڈانٹ پڑی تو نہ پوچھئے !

موسم

عابدہ ناصر، منگووال غربی

گرمی، سردی، بہار، خزاں
آتے ہیں ہر سال یہاں
پہلے سردی آتی ہے
سرد ہوائیں لاتی ہے
اس کے بعد خزاں کا نمبر
ہم کہتے ہیں جس کو پت جھڑ
اس کے بعد ہے گرمی آتی
پنکھا، اے سی، کولر لاتی
آئے اس کے بعد بہار
گوشہ گوشہ ہو گلزار
ہے سب سے برسات جدا
بادل پانی تیز ہوا

محمد سلیم مغل

امّی ابّو کا صفحہ

وہ دونوں لڑکے ہاسٹل میں رہتے تھے عادات واطوار میں دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اب روپے پیسے خرچ کرنے کا معاملہ ہی لیجیے۔ ان میں سے پہلا لڑکا تو اپنے تمام پیسے فضول خرچی میں اڑا دیتا۔ اور یہ فضول خرچی بھی محض دکھاوے کے لیے ہوتی تھی۔ نتیجے میں اسے مہینہ ختم ہونے تک قرض لینے کی نوبت آجاتی۔ اس کے برعکس دوسرا لڑکا بے حد کفایت شعار تھا۔ اور کفایت شعار بھی کیا، کنجوس تھا۔ "چمڑی جائے دمڑی نہ جائے" والی مثال اس پر صادق آتی تھی۔ خرچ کرنے کے خوف سے اکیلا رہتا اور کسی سے سلام و دُعا تک نہ رکھتا کہ مُعاً چائے نہ پلانی پڑ جائے۔ ہاسٹل کے لڑکے اُسے "مکھی چوس" کہہ کر یاد کرتے تھے۔ لڑکوں کو کنجوس لڑکا تو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، البتّہ فضول خرچ لڑکے سے وہ دوستی گانٹھے رکھتے تھے تاکہ اس کے اللّے تللّے میں خود بھی عیش کر سکیں۔ اپنی ان صفات وعادات کی وجہ سے یہ دونوں لڑکے اپنی اپنی جگہ "فضُول خرچی" اور "بخل" کی ضرب المثل بن چکے تھے۔

یہ دونوں لڑکے کسی کہانی کے فرضی کردار نہیں تھے بلکہ میں ان دونوں لڑکوں کو عرصہ دراز سے جانتا تھا۔ نہ صرف ان کو بلکہ ان کے خاندان سے اور خاندانی روایات سے بھی خوب اچھی طرح واقف تھا۔ مثلاً مجھے یہ معلوم تھا کہ ان کی یہ عادتیں یونہی پختہ نہیں ہوگئیں بلکہ اس کے پیچھے ان کے گھریلو ماحول کے پختہ اثرات موجود ہیں۔ اس فضول خرچ لڑکے کے بزرگوں سے بھی میرے دیرینہ مراسم تھے۔ جو اپنے بچّوں کو ہمیشہ بلا روک ٹوک منہ مانگا جیب خرچ دیتے تھے۔ آج بھی ان کا حال یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ دوسری طرف کنجوس لڑکے کے والد مالدار تو تھے لیکن خرچ کے معاملے میں بخل کی حد تک کفایت شعار تھے۔ یہاں تک کہ اپنی جائز ضروریات کے لیے بھی پیسہ نکالتے ہوئے ان کی جان جاتی تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی شخصیتوں کا عکس ان کے بچّوں میں آئینے کی طرح جھلکتا تھا۔ اور ان کے بچّے اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں میں کبھی اس عزّت و توقیر کے مستحق نہیں سمجھے گئے جس کی تمنّا والدین کو ہوتی ہے۔

یاد رکھیے! آپ اپنے بچّوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ آپ نقشِ اوّل ہیں اور آپ کا بچّہ نقشِ ثانی۔ بچّوں کے جیب خرچ کے سلسلے میں آپ کا محتاط اور متوازن رویّہ آپ کے بچّوں کی خوشگوار زندگی کا ضامن ہے۔

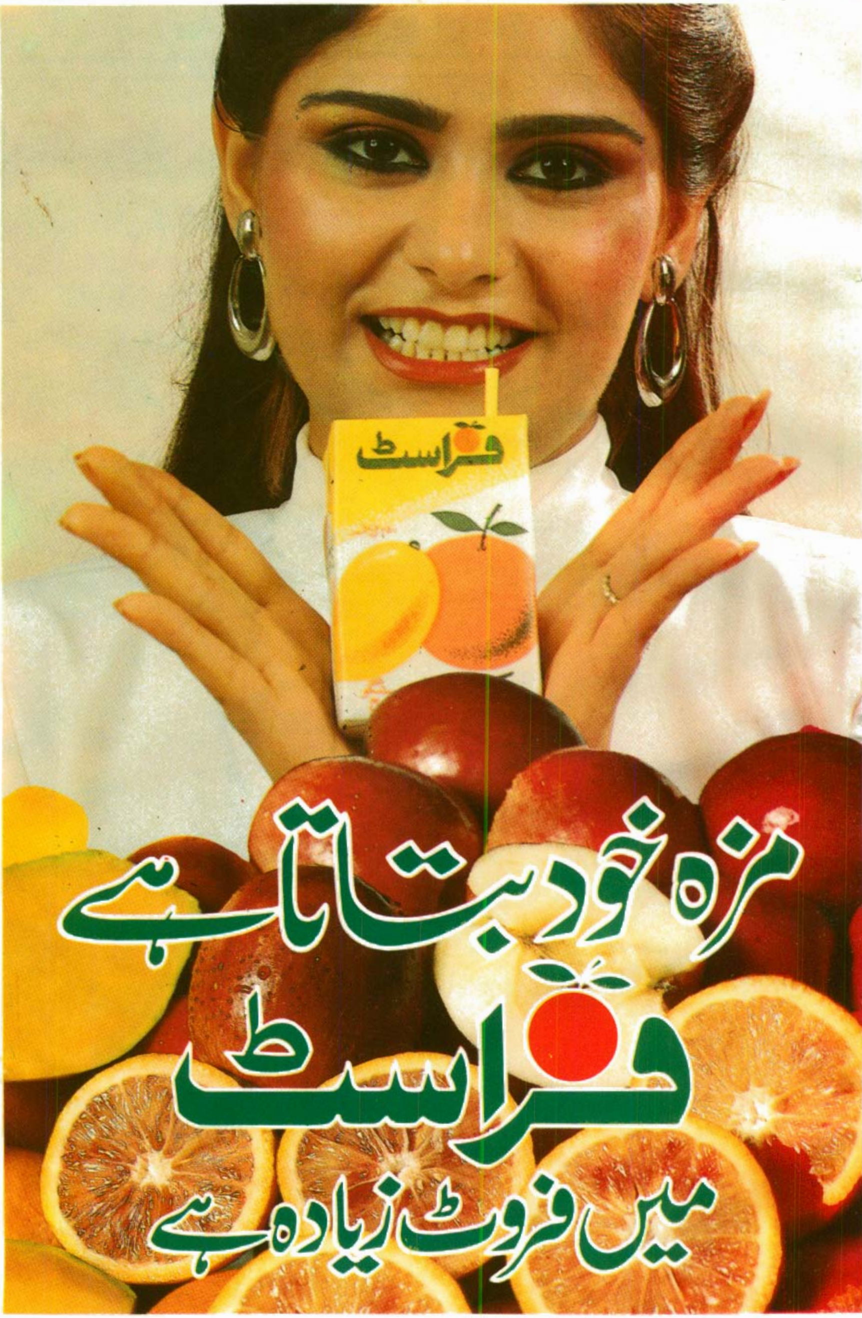
فراسٹ
مزہ خود بتاتا ہے
فراسٹ
میں فروٹ زیادہ ہے

Regd. No. M-266 JUNE 1988
Monthly AANKH MICHOLEE Karachi